

جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ فکر نہ کریں صاب۔ آپ کا غلام موجود ہے یہیں۔ میں نے یعنی کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ کسی صورت بھی مجھے اسٹیج پر آکر کچھ کہنے کو نہیں کہے گی، کیوں کہ میری طبیعت اس وقت اجازت نہیں دے رہی، لہذا تقریب کے اناؤنسر نے سب سے پہلے میری طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے میری طرف سے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک ایک کر کے تقریب میں موجود متعلقہ فن کے ماہرین کو ڈانس پر بلایا جاتا رہا اور وہ یعنی کے فن کے بارے میں اپنی رائے دے کر پلٹتے رہے۔ میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کوئی میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ ”کن خیالوں میں گم ہیں پری زاد صاحب؟“ میں عدنان کی آواز سن کر اچھل ہی تو پڑا۔ مجھے لگا، جیسے اس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ مگر وہ اپنی دُھن میں بولے گیا۔ ”آپ جانتے ہیں پری زاد! یعنی بہت خوش ہے، جانے کیا کیا منصوبے بناتی رہتی ہے سارا دن کہ جب اس کی بیٹائی واپس آجائے گی، تو وہ ایک بار پھر سے میرے ساتھ اپنے بچپن کا اسکول، محلہ، گلی، سڑکیں اور گھر دیکھنے جائے گی اور ہر وہ جگہ، جہاں سے اس کی کوئی یاد بگڑی ہے، لیکن ہر جگہ آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اس معصوم لڑکی نے اپنی زندگی کے کتنے سال اندھیروں میں کاٹ دیئے۔ میں نے بھی جیہہ کر لیا ہے کہ میرے رب کی مہربانی سے جب یعنی کی بصارت واپس آجائے گی، تو اس کے نصیب کے ہر اندھیرے کو روشنی میں بدل دوں گا۔ اور یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہو گا پری زاد صاحب۔ اصل میں یہ آپ ہی ہیں، جو ہم دونوں کی زندگی میں ضیاء بن کر آئے ہیں۔“ میں گم ضم ساعدان کی باتیں سن رہا تھا کہ اسٹیج پر سب سے آخر میں یعنی کا نام پکارا گیا، ہال میں تالیوں کی گونج کے دوران وہ دھیرے دھیرے چلتی اپنی کسی ساتھی کے سہارے ڈانس تک پہنچی تو سنا سنا سا چھا گیا۔ وہ بولی تو میرے آس پاس صرف اس کے لفظ اپنے سر بکھیرنے لگے۔ ”آج میری زندگی کا بہت بڑا دن ہے۔ اس لیے نہیں کہ آج میرے فن پاروں کی نمائش ہوئی اور ملک کے نامور فن کاروں نے میرے فن کو سراہا۔ یہ مدح سرائی تو مجھ جیسی ہر نئی آرٹسٹ کا خواب ہوتی ہے۔ مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر بھی ایک خوشی ہے۔ ایک اعزاز ہے میرے

لیے کہ میرے محسن میرے آئیڈیل نے آج میری زندگی کے اس اہم ایونٹ کا افتتاح اپنے ہاتھوں سے کیا۔ آج میں آپ سے اپنی ایک اور اہم خوشی بھی بانٹنا چاہتی ہوں۔ تین دن بعد میری یو ایس اے روانگی ہے، چند ماہ بعد جب میں واپس آؤں گی تو شاید اُس وقت مجھے اس سفید چھڑی کے سہارے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوگی اور یہ سب بھی میرے اسی محسن کی بہ دولت ہے۔ ہماری زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی آتے ہیں، جن سے قدرت ہمارے نصیب کے سارے تار جوڑ دیتی ہے۔ میری زندگی میں پہلے ایسے دو لوگ تھے، میری ماں اور میرے بچپن کا ساتھی عدنان، جنہوں نے قدم قدم میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے جینے کی راہ دکھائی، مگر اب کوئی اور بھی ہے، جو میری خوشیوں کا ضامن ہے، جس کے ہوتے ہوئے، مجھے پورا یقین ہے کہ غم کبھی میرے آس پاس بھی بھٹک نہیں سکتا، کیوں کہ کچھ لوگوں کا وجود ہی ہمارے اندر روشنی بھردینے کے لیے کافی ہوتا ہے اور آج آپ لوگ جو میرے ارد گرد یہ خوشیوں کی بہار دیکھ رہے ہیں یہ سب اسی عظیم ہستی کی دین ہے۔ وہی جو میرے محسن، میرے آئیڈیل اور دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہیں میرے لیے.....“ سارا ہال یعنی کی تقریر ختم ہونے پر تالیوں سے گونج اٹھا اور بہت دیر تک شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دی، لیکن ہال کے اس شور سے کہیں زیادہ شور اور چیخ و پکار خود میرے اندر مچی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا، بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے اندر لگے آئینے میں دوسری جانب کھڑا پری زاد مجھ سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ”تم ایک خود غرض انسان ہو پری زاد..... کیا یہی تمہاری نام نہاد محبت ہے کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی چاہت کی خوشیوں کا گلا گھونٹنے چلے ہو۔ کتنے کم ظرف ہو تم اور کتنی اعلیٰ ظرف ہے وہ کہ تمہیں اتنا مان دیتی ہے، مگر تم؟ تم اس مان کے قابل کہاں، تم بھی وہی عام دنیا دار نکلے پری زاد..... خود غرض اور مطلب پرست، جتنا تمہارا تن میلا ہے، اتنا ہی تمہارا من گدلا، یہی تمہاری اصلیت اور یہی تمہاری اوقات ہے پری زاد۔“ میرے اندر کی آوازیں اتنی بلند ہونے لگیں کہ میں نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور ٹھیک اسی لمحے اس کی ملائم آواز سنائی دی۔ ”پری زاد..... کہاں مجھے بیٹھے ہیں آپ! میں آپ کو سارے ہال میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ میں نے گھبرا کر یعنی کی طرف دیکھا۔ تقریب ختم ہو چکی تھی اور لوگ ایک ایک کر کے یعنی کو کامیاب نمائش پر مبارکباد دے کر واپس پلٹ رہے تھے۔ ”ہاں، ہاں میں ٹھیک ہوں۔ یونہی بس ذرا بھیڑ میں جی گھبرا رہا تھا۔ تم بتاؤ، تم خوش تو ہونا!! آج تم نے یہ معرکہ بھی سر کر ہی لیا۔“ یعنی ہنس پڑی، وہ بہت ہلکی پھلکی سی لگ رہی تھی۔ ”جناب! یہ سارے معرکے آپ کی وجہ سے سر ہو رہے ہیں۔ پتا ہے، عدنان تو مجھے کہتا ہے کہ آپ میری زندگی میں میرا کلی چارم بن کر آئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے آپ کی شاعرانہ گفتگو میں، خوش نصیبی کا ستارہ۔“ عدنان کے ذکر پر جیسے مجھے سب کچھ دوبارہ یاد آ گیا اور میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ”مگر یہ عدنان ہے کہاں، دکھائی نہیں دے رہا؟“ یعنی مسکرائی ”پتا نہیں، کہہ رہا تھا، مجھے کوئی سر پر اُزدینا چاہتا ہے۔ شاید اسی سلسلے میں باہر گیا ہے۔ بس آتا ہی ہو گا۔“ میرے ہوش اُڑ گئے۔ عدنان تنہا باہر نکل چکا تھا۔ میں نے جلدی سے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے یعنی کو وہیں رکنے کا کہا اور جلدی میں باہر کی جانب لپکا۔ میرے سارے خدشے شاید آج ہی درست ثابت ہونا تھے۔ میری گاڑی کے قریب میرا ڈرائیور اور گھر کا دوسرا گارڈ مستعد کھڑے تھے۔ میں نے ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا ”کبیر خان کہاں ہے؟“ ڈرائیور نے ادب سے جواب دیا کہ وہ کسی کام کا کہہ کر باہر نکلا ہے۔ میرے ساتھ جانے کے لیے اس نے گھر سے دوسرا گارڈ طلب کر لیا تھا۔ اسی گارڈ نے مجھے بتایا کہ کبیر خان کسی پرائیویٹ گاڑی میں باہر نکلا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ یقیناً کبیر خان عدنان کے پیچھے گیا تھا تا کہ موقع پا کر اسے ختم کر دے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتی رہی، مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے جلدی سے دوبارہ نمبر ملا یا میرے اندر سمندر کی تیز لہروں جیسا شور مٹا رہا تھا۔ ”فون اٹھاؤ کبیر خان، ورنہ آج ہم دونوں کے ہاتھوں ایک گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے گا۔ فون اٹھاؤ کبیر..... خدا کے لیے فون اٹھاؤ.....“ میں نے خود کلامی کرتے ہوئے پانچویں مرتبہ کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھالیا۔ میری آواز کانپ گئی۔ ”تم کہاں ہو کبیر خان! جلدی واپس لوٹ آؤ۔“ دوسری جانب ٹریفک کا بہت شور تھا۔ ”ہم شکار کے پیچھے آیا ہے صاب، تم فکر مت کرو، وہ اس وقت ٹھیک ہمارا نشانہ پر ہے۔“ میں نے چیخ کر کہا ”نہیں، کبیر خان! ایسی غلطی مت کرنا۔ میرا حکم ہے کہ فوراً واپس آجاؤ۔“ دوسری جانب کبیر کو میری آواز ٹھیک سنائی نہیں دی۔ ”بہت شور ہے صاب۔ ہم کام ختم کرتے ہی واپس آتا ہے..... وہ لڑکا دوسرا گاڑی میں ہمارا نشانہ پر ہے۔ بس ایک منٹ اور.....“ کبیر کی آواز کٹ گئی..... میں اتنی زور سے چلایا کہ ساری پارکنگ میری آواز سے گونج اٹھی۔ ”تم اس لڑکے کو نہیں مارو گے کبیر خان! یہ میرا حکم.....“ میری آواز درمیان ہی میں گھٹ گئی۔ دوسری جانب کے شور میں مجھے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ شاید کسی نے فائر کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے فون زمین پر گر گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں سرکپڑ کرو ہیں زمین پر بیٹھ گیا، کچھ لحوں کے لیے ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر اچانک مجھے یوں لگا، جیسے قریب پڑے میرے سیل فون سے ابھی تک کبیر خان کی آواز آرہی ہو۔ میں نے جلدی سے فون اٹھایا، دوسری طرف وہی تھا ”کیا ہوا صاب..... اس طرف بہت شور تھا، ابھی بولو.....“ میں نے چلا کر کبیر سے پوچھا ”کیا تم نے اسے مار دیا کبیر.....؟“ ”نہیں صاب.....! دھڑکنے پر وہ بالکل نشانے پر تھا، مگر چوک پر کوئی حادثہ ہو گیا، اس لیے رش جمع ہو گیا، مگر ہم اس کے پیچھے ہے، ایک سنان سڑک پر.....“ میری آواز بیٹھ گئی ”نہیں کبیر خان، نہیں! تم واپس آ جاؤ“۔ کبیر نے احتجاج کیا ”مگر صاب.....!!“ میں نے غصے سے چیخ کر کہا ”یہ میرا حکم ہے، فوراً واپس آؤ“ ”ٹھیک ہے صاب“۔ کبیر نے فون کاٹ دیا۔ میں اس طرح گہرے گہرے سانس لے رہا تھا، جیسے میلوں دُور سے بھاگ کر آیا ہوں، پھر مجھ سے وہاں ٹھہرا نہیں گیا اور میں گھر واپس لوٹ آیا۔ خود کو کمرے میں بند کر کے اندھیروں کے حوالے کر دیا۔ آج میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری بازی ہار آیا تھا۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا میرے پاس۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں تجویزوں میں بھری اپنی ساری دولت کو، اس عالی شان گھر کے صحن میں جمع کر کے اپنے ہر اثاثے سمیت جلا کر رکھ کر دوں، آگ لگا دوں اس ساری جائیداد اور شان و شوکت کو، کس کام کا تھا یہ سب کچھ۔ اتنا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی میرے دل کا دامن آج بھی اسی ہڈی زاد کی طرح تہی دست اور خالی تھا، جو کبھی اسی شہر کے ایک کچے مکان میں رہا کرتا تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دل کی ویران خالی بستیاں مقدروں سے بسا کرتی ہیں اور میرے نصیب میں میرے مَن کی یہی سُونی حویلی ہی لکھی تھی، لیکن اب میں اپنے اس دشمن دل کی مزید کسی چال میں آنے والا نہیں تھا۔ بہت مَن مانیاں کر چکا تھا یہ اپنی، بڑی ذلت اور خواری اٹھائی تھی آج تک میں نے اس دل کے کہنے میں آکر، مگر اب اس وحشی دل کو سزا دینے کا وقت آچکا تھا اور مجھ جیسے دل جُلتے جب خود کو سزا دینے پر آتے ہیں، تو وہ سزا بڑی سخت ہوتی ہے۔ اگلے روز میں نے ایک پاور آف انارنی کے ذریعے کچھ اہم فیصلے کیے۔ اپنے تمام پھیلے ہوئے کاروبار اور عملے کو ایک ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام کر کے سب کے حصے مقرر کر دیے۔ میری آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ اسی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر پال کے پلاسٹک سرجری کے ادارے کو جاتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر پال کو ایک آخری ای میل لکھی۔ ”محترم ڈاکٹر پال! میں نے اپنی پلاسٹک سرجری کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، کیوں کہ آپ ہی کے ادارے کی تعارفی سطر کے مطابق یہ بات بالکل درست نکلی کہ چہرے بدلے جاسکتے ہیں، تقدیریں نہیں۔ اور مجھے شاید اس بات کا احساس بہت دیر میں ہوا کہ مجھے اپنی تقدیر بدلنے کی ضرورت چہرے بدلنے سے کہیں زیادہ تھی، مگر افسوس، میں کسی ایسے ادارے کو نہیں جانتا، جو اللہ سے سفارش کر کے میری تقدیر بدل ڈالتا۔ میرے ادارے کی آمدنی سے ایک بڑا حصہ ہر ماہ آپ کے ادارے کو ملتا رہے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ یہ رقم اُن لوگوں کے مفت علاج پر صرف کیجیے گا، جو اپنی سرجری کروانا چاہتے ہیں، مگر اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ میری آمدنی کا دوسرا بڑا حصہ میرے اپنے ملک میں ایسے پلاسٹک سرجری کے اداروں کو جائے گا، جو یہاں کے نادار مریضوں کے چہروں کا علاج کریں گے اور پوری سہولیات نہ ہونے کی صورت میں، ایسے لوگوں کو آپ کے ادارے تک پہنچائیں گے۔ میرا اسٹاف آپ کے ادارے کو یہاں کے اداروں سے منسلک کروادے گا۔ یہ میری آخری ای میل ہے، کیوں کہ اس کے بعد میں خود کو اس دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم کر دوں گا، اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ جس کے لیے میں اپنے چہرے کی سرجری کروا کر اسے خوش نما بنانا چاہتا تھا، وہ کبھی میرے اس چہرے کو دیکھے اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے حقارت یا ہم دردی کی وہ لہر پیدا ہو، جو ازل سے میرا مقدر ہے، اور اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ لمحہ میرے لیے موت کی اذیت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہوگا۔ میں نے ساری دنیا کی نظریں جھیل لیں، مگر اس ایک نظر کو کبھی برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا..... دعا گو، پری زاد.....“

شام تک سارے کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ کمالی سمیت چند دیگر سینئر اور وفادار عملے کے ارکان کو بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کر دیا گیا۔ میرے بہن بھائیوں، دوستوں، رشتے داروں اور عملے سمیت سبھی کے لیے ماہانہ مشاہرے کے علاوہ حصے کے طور پر ایک معقول رقم مخصوص کر دی گئی۔ میں نے کچھ ایسا انتظام کر دیا تھا کہ میرے جانے کے بعد بھی سارا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے۔ جب کمالی کو میں نے رات گئے طلب کر کے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا، تو وہ ایک دم گھبرا سا گیا ”مگر سر! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور معاف کیجیے گا سر، یہ پاور آف انارنی سے کہیں زیادہ کوئی وصیت نامہ لگتا ہے۔ میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گا، اسٹاف سے یہ سب کچھ اکیلے نہیں سنبھالے گا سر!“ میں نے اسے تسلی دی ”فکرمات کرو، سب یونہی چلتا رہے گا، اور میں کہیں نہیں جا رہا..... بس اچانک کچھ ضروری مسائل پیش آ گئے ہیں، اس لیے کچھ عرصہ شاید غیر حاضر ہوں گا اور یاد رہے، میرے کہیں جانے تک یہ کاغذ تمہارے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرا یہ بھرم ضرور قائم رکھو گے“۔ کمالی کی پلکیں بھیگ گئیں ”میں آخری سانس تک آپ کا ہر بھرم نبھاؤں گا سر، مگر یہ تو بتادیں کہ آپ جا کہاں رہے ہیں؟ کبھی آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کیسے کیا جائے؟“ ”فی الحال تو میرا خود اپنے آپ سے رابطہ بھی ممکن نہیں ہے کمالی، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں مطلع کر سکوں۔ اب تم جاؤ، اور ہاں، کبیر خان کا خاص خیال رکھنا، ایسے وفادار بہت نایاب ہوتے ہیں“۔ کمالی افسردہ سا، دل میں بہت سی باتیں لیے لوٹ گیا۔ کچھ دیر میں کبیر خان آ گیا۔ وہ کچھ چُپ چُپ سا تھا۔ میں نے مُسکرا کر اسے دیکھا۔ ”مجھ سے ابھی تک ناراض ہو کبیر خان؟“ کبیر نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ ”نہیں صاب..... ہم تو آپ کا غلام ہے۔ مگر آپ نے اس ڈاکٹر کو معاف کر کے اچھا نہیں کیا۔ دشمن پر رحم نہیں کھانا چاہیے، کیوں کہ جب اس کا وقت آئے گا تو وہ آپ پر رحم نہیں کرے گا“۔ میں نے ایک گہری سانس لی ”تم ٹھیک کہتے ہو کبیر خان، مگر محبت شاید ہمیں بزدل بنادیتی ہے۔ کبھی کبھی محبت میں ہم ایسے لوگوں کو بھی بخش دیتے ہیں، جو خود ہمارے قتل کا باعث بن جاتے ہیں اور اس جنگل نما دنیا کا بس یہی تو قانون ہے، مار دیا پھر خود مر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں نے خود کو مار دیا ہے کبیر خان.....“ کبیر سر نہ کھکھکائے واپس چلا گیا۔

اگلے دو دن بھی ہڈ لگا کر اڑ گئے اور پھر عدنان اور عینی کی امریکا روانگی کا دن بھی آ گیا۔ وہ دونوں بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔ عینی کی اب بھی وہی ضد تھی۔ ”میں تو کہتی ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، تین چار ہفتے میں سارے ٹیسٹ ہو جائیں گے، اور پھر آپ پریشن کے بعد ہم سب اکٹھے واپس

آجائیں گے۔ کتنا مزہ آئے گا، جب ہم تینوں وہاں ایک ساتھ ہوں گے، ورنہ یہ عدنان تو اپنی بورنگ باتوں سے میرا سر کھاجائے گا اتنے بہت سے دن“ میں نے وعدہ کیا۔ تم لوگ پہنچو، میں بھی جلد آنے کی کوشش کروں گا، یہاں پیچھے بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں۔“ عدنان نے سر ہلایا ”کوشش نہیں جناب، آپ کو اس لمبی کے آپریشن سے پہلے ہر حال میں پہنچنا ہی ہوگا۔ اسے اکیلے برداشت کرنا خود میرے بس کی بات بھی نہیں ہے، ہاں البتہ آپ کی موجودگی میں کافی سویر برتاؤ کرتی ہے۔“ یعنی نے اسے گھورا ”بکومت، پُری زاد جانتے ہیں کہ میں کتنی سو برا اور ویل میزڈ ہوں، تمہاری گواہی کی ضرورت نہیں۔“ اتنے میں اندر سے ان کی فلائٹ کا اعلان ہونے لگا۔ میں نے اُن دونوں کو رخصت کیا ”ٹھیک ہے بابا، تم دونوں ہی بہت اچھے ہو۔ چلو، اب دیر نہ کرو، فلائٹ کا اعلان ہو گیا ہے۔“ یعنی جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے پلٹی، میرا دل بے قابو ہونے لگا، وہ میرا سب کچھ لوٹ کر اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں ”پُری زاد، وقت پر پہنچنے کی کوشش کیجیے گا۔ میں وہاں روزانہ آپ کو بہت یاد کروں گی، اپنا بہت خیال رکھیے گا۔“ میری آواز کپکپاسی گئی۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بہت زور سے مسل ڈالا ہو ”تم بھی ہمیشہ میری یادوں میں رہو گی، میری پیاری آر بے.....“ اوداع.....“ وہ ایک لمحہ رُکی اور پلٹ کر اندر لاؤنج کی جانب بڑھ گئی۔ میں بہت دیر تک اسے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوتا دیکھتا رہا۔ اپنی زندگی کے، خود سے قدم بہ قدم دور جانے کا یہ نظارہ شاید دنیا میں مجھ سے پہلے کسی بد نصیب نے نہ کیا ہو۔ یعنی چلی گئی۔ میں، جہاز کی اڑان بھرنے کی اناؤنسمنٹ تک وہیں بیٹھا رہا۔ لوہے اور چند دیگر دھاتوں کا بنا ہوا ایک دیوہیکل ہوائی جہاز مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر بہت دُور اڑان بھر گیا۔

گھر واپس لوٹا تو آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی نکالے، مگر کبیر خان کو اطلاع نہ کرے۔ مجھے شاید کچھ دیر کے لیے کام سے باہر جانا پڑے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر میں نے روزمرہ اور ماہانہ خرچوں کے کچھ چیکس پر دستخط کیے اور کمالی کے نام ایک خط میں سارے معاملات کی تفصیل لکھ ڈالی۔ فجر سے کچھ دیر قبل میں تنہا گھر سے باہر نکلا اور ڈرائیور کو ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ یعنی کے جانے کے بعد میرا دل اور دماغ جیسے بالکل سُن سے ہو گئے تھے۔ میں چل پھر رہا تھا، سانس لے رہا تھا، مگر زندہ نہیں تھا۔ پتا نہیں صرف سانس لینا ہی زندگی کی شرط کیوں ٹھہرا دی گئی ہے؟ جیون تو اس سے کہیں بڑھ کر اور سوا ہے۔ ڈرائیور کو باہر انتظار کرتے چھوڑ کر میں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچا تو کوئی گاڑی رواں گئی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میں نے ہنسنا سوچے سمجھے آخری اسٹیشن کا ٹکٹ لیا اور درجہ بندی کے اہتمام کی فکر کیے بغیر پہلی بوگی میں سوار ہو کر ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں ٹرین نے سیٹی بجائی اور پلیٹ فارم چھوڑ دیا، مگر یادیں دماغ کا پلیٹ فارم بھلا کر چھوڑتی ہیں۔ ٹرین اسٹیشن در اسٹیشن ہوتی جانے کہاں چلی جا رہی تھی۔ لوگ ڈبے میں سوار ہوتے اور اپنی منزل آنے پر اترتے رہے، مگر میری منزل کہاں تھی۔ یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔ دو دن بعد ٹرین کسی بڑے جنکشن پر آ کر کھڑی ہو گئی اور کبھی مسافر اتر گئے۔ پتا چلا کہ یہ آخری اسٹیشن ہے۔ اب اگلے دن یہی ٹرین یہاں سے واپس میرے شہر تک جائے گی۔ کاش! یہ ٹرین تمام عمر یونہی چلتی رہتی، آگے بڑھتی رہتی اور اس کا کوئی آخری اسٹیشن نہ آتا۔ کتنا نادان تھا میں، کیا سوچ کر ٹرین میں آ بیٹھا تھا کہ میرے بقیہ تمام عُمر کا سفر اسی ٹرین میں کٹ جائے گا۔ جب تیسری بار ٹرین کے عملے نے مجھے آکر یہ بتایا کہ اب یہ گاڑی آگے کہیں نہیں جائے گی، تو میں نیچے اتر آیا اور کچھ فاصلے پر بچھے لکڑی کے ایک پُرانے سے بیچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ دنیا کے سارے ریلوے اسٹیشن شاید ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ ناساز ٹھیک ہی کہتا تھا، منزلیں اپنی جگہ ہیں، راستے اپنی جگہ، جب قدم ہی ساتھ نہ دیں، تو مسافر کیا کرے؟ یہاں پر موجود سبھی مسافر کوئی نہ کوئی منزل اور مقصد سفر رکھتے تھے۔ ہر کسی کو کہیں جانے کی جلدی تھی، بچے، بوڑھے، عورتیں اور مرد، بھیڑ، جھوم اور بھانت بھانت کی بولیاں، بجلت، زادراہ اور راستوں کی فکر۔ سبھی کسی نہ کسی دُھن میں مگن تھے، مگر میں بے حس سا بیٹھا اطمینان سے یہ سب دیکھتا رہا۔ شام ڈھلی اور پھر گہری رات نے ڈیرے ڈال دیئے۔ میرے پیچھے وہاں گھر میں ضرور طوفان آچکا ہوگا۔ کئی گھنٹے انتظار کے بعد میرے واپس نہ لوٹنے پر کبیر نے ضرور اسٹیشن کے باہر میرے انتظار میں کھڑے ڈرائیور سے رابطہ کیا ہوگا یا وہ اس سے بھی پہلے میری تلاش میں نکل چکا ہوگا اور پھر جب ان لوگوں نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پایا ہوگا، تو گھر میں کھرام مچ گیا ہوگا۔ کمالی کو تو میرے جانے کا تھوڑا بہت علم تھا، مگر کبیر تک کر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ وہ ضرور میری تلاش میں سب چھوڑ چھاڑ گھر سے نکل پڑا ہوگا۔ کہیں وہ دوسری ٹرین پکڑ کر ہر اسٹیشن کھوجتا یہاں تک بھی نہ آ پہنچے۔ میں گھبرا کر لڑکھڑا گیا۔ گھر سے نکلنے وقت میرے کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے میں بہت سے بڑے نوٹ ابھی باقی تھے۔ میں نے ٹکٹ گھر سے کسی دوسری مخالف سمت جاتی گاڑی کا ایک ٹکٹ لیا اور صبح منہ اندھیرے اس گاؤں میں سوار ہو کر پھر سے ڈبے سے باہر کی بھاگتی دنیا کا نظارہ شروع کر دیا۔ مجھے اپنے ماضی، اپنے دل کی حماقتوں اور اپنی پرانی پہچان سے کچھ ایسی چو ہو گئی تھی کہ میں نے اگلے کئی دنوں تک اسی بے مقصد سفر کو اپنی ذات کھودینے کا بہانہ بنالیا۔ جہاں گاڑی رُک جاتی، میں وہاں سے کسی اور جانب کا کوئی ٹکٹ لے کر کسی اور گاڑی میں بیٹھ جاتا۔ مجھے شہروں یا بستیوں کے ناموں سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ ہی میں نے اس عرصے میں کسی ریلوے پلیٹ فارم سے باہر نکل کر اس شہر، بستی یا گاؤں کو نظر بھر دیکھا تھا۔ میں تو بس چلتے رہنا چاہتا تھا۔ میری شیو بڑھتے بڑھتے داڑھی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی اور میرے کپڑے دھول اور مٹی سے غرق ہو چکے تھے، مگر اب مجھے کسی چیز سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جہاں بھوک یا پیاس کا احساس ستاتا تو میں اتر کر کسی پلیٹ فارم پر لگے ٹکٹ سے پیاس بجھا لیتا اور کسی ٹھیلے والے سے کچھ لے کر کھا لیتا، مجھ پر ایک عجیب سی حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ اسی دو گھنٹ پانی اور چار لقموں کے لیے ہم اپنی زندگیوں کو عُمر بھر نہ جانے کیسے کیسے عذاب اور جو کھم میں ڈالے رکھتے ہیں، جب کہ ان دونوں چیزوں کا حصول کبھی اتنی زندگی کا طلب گار نہیں ہوتا، جتنی زندگی ہم اس بھوک اور پیاس کے لیے گناتے ہیں۔ رفتہ رفتہ میری جیب میں موجود رقم ختم ہونے لگی اور پھر ایک دن جب کسی قصبے کے چھوٹے اسٹیشن پر میں نے جیب سے ٹکٹ لینے کے لیے پیسے نکالنا چاہے، تو میرے ہاتھوں میں صرف چند سکے آئے۔ میں نے الٹ پلٹ کر ساری جیبیں دیکھ ڈالیں، مگر کچھ بھی نہ پتا تھا، میں تھکا ہارا سا اسٹیشن سے باہر آ گیا، دُور ایک تانگے والا درخت کے سائے میں کھڑا اپنے گھوڑے کو چارہ ڈال رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکا۔ ”کہاں جاؤ گے بادشاہو..... اس علاقے کے تو نہیں لگتے.....“ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سارے سکے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے ”جہاں تک یہ سکے لے جاسکتے ہیں، لے چلو۔ اس بستی سے پُرے، کسی ویرانے میں.....“ تانگے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”بستی سے پُرے تو قبرستان ہے..... اوہ اچھا، اب سمجھا، کسی بڑے بوڑھے کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ، میں پہنچا دیتا ہوں۔“ میں پُپ چاپ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تانگے والے نے قصبے کے باہر ہی سے ایک لمبا چکر کاٹ کر ایک بڑے سے قبرستان کی چار دیواری کے باہر تانگا روک دیا ”واپس جاؤ گے، میں یہیں انتظار کروں کیا؟“ میں خالی ذہن لیے نیچے اتر آیا۔ ”نہیں تم جاؤ، میں دیر تک یہاں رکوں گا۔“ تانگے والے کے چہرے پر ایک بار پھر بہت سے سوال ابھرے، مگر میرا بے زار سا رویہ دیکھ کر اس نے مجھ سے مزید کوئی بات نہیں کی اور چابک مار کرتا تانگا موڑ لیا اور کچھ ہی دیر میں ویران سڑک کے آس پاس بکھرے کھیتوں میں کہیں گم ہو گیا۔ میں کچھ دیر تک یونہی باہر کھڑا سوچتا رہا اور پھر قبرستان کے لکڑی والے بڑے گیٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ دُور دُور تک نئی اور پرانی قبروں کا ایک جال سا بچھا تھا۔ میں قبروں کے کتبے اور ان پر لکھے سن وفات پڑھتا ہوا آگے بڑھتا رہا، کچھ تازہ قبروں پر اگر بتیوں کے جلے ہوئے ٹوٹے اور کچھ ماش کے دانے بکھرے ہوئے تھے، مگر جھائے ہوئے خشک

پھولوں کی پتیاں جا بجا نکھری تھیں۔ جانے لوگ مٹی میں چلے جانے والوں کے لیے اتنے پھول لے کر کیوں آتے ہیں۔ اس کی زندگی ہی میں اسے گلابوں سے کیوں نہیں نہارتے۔ چلتے چلتے میں تھک گیا تو ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔

ایک عجیب سی خاموشی چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ انسان کی ٹہر بھری فریاد اور چیخ پکار کا صلہ بس یہی اک خاموشی ہے۔ اچانک میرے بہت قریب ایک کرخت سی آواز ابھری۔ ”کون ہے بھئی تُو..... اور یہاں کیا کر رہا ہے؟“ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک سخت گیر سا بڈیوں کے ڈھانچے نما بوڑھا کمر پر ہاتھ رکھے تنا ہوا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ ”میں..... وہ..... دراصل.....“ اس نے کڑے تیوروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کوئی قبر کھدوانی ہے کیا؟“ ”نہیں نہیں، میں تو بس.....“ اس نے مجھے دوبارہ سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ ”اچھا..... میں سمجھا، ڈاکٹری کی پڑھائی والوں کے لیے پُرانی قبروں سے ہڈیاں پڑانے آیا ہے تُو..... پر کان کھول کر سن لے، فقیر انا م ہے میرا۔ میرے باپ دادا بھی اسی قبرستان کے گورکن تھے خبردار، جو یہاں سے ایک ہڈی بھی ادھر ادھر کی..... ہاں، میرے ساتھ سیدھی طرح سودا کرے گا تو میں خود تیرے مطلب کی ہڈیاں تجھے بیچ دوں گا۔“ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کرخت طبیعت بوڑھے کو کیسے سمجھاؤں کہ جو وہ مجھے سمجھ رہا ہے، میں وہ نہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”نہیں، میں یہاں مُردوں کی ہڈیاں تلاش کرنے نہیں آیا۔ تھک گیا تھا، اس لیے کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے رک گیا۔“ فقیر نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کہیں تُو، اس چھوٹے قبرستان کے گورکن سلائے کا ساتھی تو نہیں ہے، سچ بتا، کس ارادے سے یہاں آیا تھا؟“ مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے سخت لہجے میں فقیر کے کو جھاڑ دیا۔ ”تمہیں ایک باری کہی بات سمجھ نہیں آتی کیا۔ میں کسی سلائے کو نہیں جانتا اور نہ ہی میرا تمہاری قبروں کی اس جا گیر پر قبضے کا کوئی ارادہ ہے۔ میں مسافر ہوں، بس راہ بھٹک کر اس طرف آ گیا تھا۔ سوچا تھا، شاید یہاں کچھ سنگون مل جائے، مگر یہاں بھی تم جیسے بیوپاری، ٹھیکے دار بیٹھے ہیں۔“ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ پیچھے سے فقیر کی ڈھیلی سی آواز سنائی دی ”ڈرائرک تو سہی.....“ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا ”معاف کر دے، دراصل پچھلے چند دنوں سے یہ سارے گدھ میرے قبرستان پر نظر میں جمائے بیٹھے ہیں۔ ایک عامل کو بھی بھیجا تھا لوگوں کو ڈرا کر بھگانے کے لیے۔ اس لیے میں سمجھا کہ پھر انہی کی کوئی شرارت ہے۔ نام کیا ہے تیرا، اس علاقے کا تو نہیں لگتا۔“ مجھے جلدی میں کوئی دوسرا نام نہیں سوچا تو میں نے اپنے پُرانے ڈرائیور کا نام بتا دیا ”اکبر نام ہے میرا..... میں یہاں کا نہیں ہوں، بلکہ میں کہیں کا نہیں ہوں۔ نہ گھربار ہے نہ کوئی رشتے دار۔ بس، یونہی بستی بستی بھٹکتا رہتا ہوں۔ یہاں بھی بھٹکتے ہوئے ہی آ گیا تھا۔ تم ناراض ہوتے ہو تو یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں۔“ فقیر بالکل ہی نرم پڑ گیا ”او نہیں نہیں، بس ایسے ہی غصے میں کچھ زیادہ بک گیا میں۔ تیرا جب تک جی چاہے، یہاں رہ سکتا ہے۔ آدمی تو مجھے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ روٹی کھائے گا؟“ میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں الٹ دیا ”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ فقیر اذور سے ہنس پڑا ”اوئے جھلے! پیسے کس نے مانگے ہیں تجھ سے، چل آ جا، میری کوٹھری میں اسی قبرستان میں ہے۔ صبح ہی ایک مُردہ دفنایا تھا، اس کے گھروالے بیٹھے چاولوں کی دیگ بانٹ گئے تھے۔ ابھی بہت سے چاول پڑے ہیں۔“ میں چپ چاپ فقیر کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی چھوٹی سی کنیا میں ایک جھلنگ سی چار پائی، کونے میں پڑی پانی کی صراحی اور گلاس اور ایک جانب چھوٹی سی دیوار کے پیچھے بنے باورچی خانہ نما کونے میں چند پرانے سلور کے برتن پڑے تھے۔ ایک جانب گینتی، بیلچہ، کدال، رتنی اور قبر کھودنے کا دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ فقیر نے ایک پلیٹ میں چاول ڈال کر میرے سامنے رکھ دیئے اور مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا کہ وہ یہاں تنہا رہتا ہے۔ شادی اس نے کبھی کی نہیں، اور میری طرح اس کا بھی کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ باتوں باتوں میں شام ڈھل گئی اور جب میں فقیر کی کنیا سے باہر نکلا تو رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے فقیر سے رخصت چاہی تو اس نے مجھ سے پوچھا ”اب کہاں جائے گا.....؟“ ”پتا نہیں، جہاں یہ رستہ لے جائے۔“ فقیر نے چند لمحے سوچا اور پھر مجھے آواز دے کر روک لیا ”تُو یہیں کیوں نہیں رہ جاتا، تیرا ٹھکانہ بھی ہو جائے گا اور میرا ہاتھ بٹانے والا بھی مجھے مل جائے گا“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا ”مگر میں یہاں کیا کروں گا.....؟“ وہ زور سے ہنسا۔ ”میری طرح قبریں کھودے گا اور کیا کرے گا.....؟؟“

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توبنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رفقاء، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہوا وی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@jangggroup.com.pk

میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ ”کیا.....!! میں نے آج تک کبھی کوئی قبر نہیں کھودی“۔ فقیر ازور سے ہنسا۔ ”جھوٹ بولتا ہے تو! ہم سب تو ہر وقت کسی نہ کسی کی قبر کھود رہے ہوتے ہیں۔ فکر نہ کر، میں تجھے سب سکھا دوں گا، محنت سے جی تو نہیں پڑائے گا؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”اب میرے پاس پڑانے کے لیے کچھ نہیں ہے، جی بھی نہیں“۔ فقیرے نے سنی اُن سنی کر دی۔ ”ٹھیک ہے پھر آجا اور ہاں، تُو نے یہ کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں، لگتا ہے کسی گورے انگریز کی قبر سے پڑا کر لایا ہے یا پھر لنڈے بازار کا مال ہے، گور کن ایسے کپڑے نہیں پہنتے، چل کیا یاد کرے گا، میں تجھے اپنا ایک جوڑا دے دوں گا، کپڑے بدل کر آرام کر لے، صبح بڑا کام کرنا ہے“۔ ہم دونوں اندر جھوپڑی میں داخل ہو گئے۔ فقیرے نے کسی کونے میں پڑے ایک ٹرنک سے ایک بستر نما گدیلا اور ایک چادر نکال کر میرے حوالے کر دی۔ ”یہیں ایک طرف اپنا بستر ڈال لے اور میں رات کو ذرا دیر سے سوتا ہوں، تیری آنکھ لگے تو بھلے سو جانا“۔ فقیرے نے اپنی جیب سے ایک مخصوص برانڈ کی بیڑی ٹٹولی اور اپنی چارپائی کے نیچے کے نیچے سے ایک پڑیا نکالی اور کاغذ میں لپیٹی بہت سی بھورے رنگ کی راڈ نما تیلیوں میں سے ایک چُن کر اُسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر گزرنے لگا اور کچھ ہی دیر میں وہ اس تیلی کی ایک چھوٹی سی گولی بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے وہ گولی بیڑی کے تمباکو میں شامل کر کے بیڑی دوبارہ جوڑ کر سلگالی۔ جھوپڑی میں ایک عجیب سی ناگوار بو پھیل گئی۔ فقیرے نے زوردار تیسرا کش لگایا اور دھواں فضا میں پھیلا کر بولا۔ ”کبھی چرس پی ہے اکبرے.....؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ زور سے ہنسا۔ ”اچھا ہے نہ پیا کر، خون بھی جلا کر پی جاتی ہے یہ کم بخت۔ پر میرا اس کے بنا گزارا نہیں، قبرستان کی راتیں بڑی کالی اور لمبی ہوتی ہیں، سچ بتاؤں تو نو جوانی میں مجھے یہاں اکیلے رہتے بڑا ڈر لگتا تھا، بس انہی دنوں میں یہ لت لگ گئی“۔ فقیرا ساری رات نہ جانے کیا کچھ بڑبڑاتا رہا اور میں چپ چاپ اس کی رام کہانی سناتا رہا۔ شاید اسے بہت دنوں کے بعد کوئی سننے والا ملتا تھا، پھر نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب تک وہ بولتا رہا، میرا دھیان بٹا رہا، مگر خاموشی ہوتے ہی میرے اندر چھپے کئی آسیب اور عفریت مجھے سالم نگنے کے لیے اندھیرے میں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

مجھے گھر چھوڑے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ اب تک تو انہوں نے تھک ہار کر میری کھوج ختم کر دی ہو گی۔ وہاں نیویارک میں یعنی کے تمام ٹیمٹ ہو چکے ہوں گے اور شاید آج کل میں اس کا آپریشن بھی ہونے والا ہو گا۔ وہ مجھے عین وقت پر وہاں نہ پا کر کتنی مایوس ہوئی ہو گی، مگر یہ مایوسی یقیناً اُس مایوسی سے کہیں کم ہو گی، جو آنکھیں ملنے کے بعد اسے مجھے دیکھ کر ہوتی۔ عدنان نے ضرور اسے سمجھا بُھا کر آپریشن پر راضی کر لیا ہو گا۔ کتنی خوش ہو گی وہ، جب پہلی بار، برسوں بعد اس دنیا کے رنگوں کو اپنی خوب صورت آنکھوں سے دیکھے گی۔ ساری رات باہر قبرستان کے ویرانے سے گیدڑوں، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں اور فقیرا بے سُدھ پڑا خزانے لیتا رہا۔ وہاں میرے آس پاس سب ہی تو سو رہے تھے، کچھ اپنی اپنی قبروں میں اور فقیرا اپنی چارپائی پر، بس ایک میں ہی تھا، جسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ صبح ہوئی تو فقیرا اپنے اوزار اٹھا کر میرے ساتھ کنیا سے باہر نکل آیا۔ اس نے آس پاس پھر کر غنی قبر کے لیے جگہ منتخب کی اور پھر کسی بوڑھے گدھ کی طرح قبرستان کے داخلی دروازے پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ گھنٹے بھر بعد ہی کچھ غم زدہ سے لوگ قبرستان میں داخل ہوئے اور فقیرے کو نئی قبر کا بیعانہ پکڑا گئے۔ فقیرے نے ان کے جاتے ہی خوشی سے نعرہ لگایا۔ ”واہ بھی اکبرے تُو تو میرے لیے بڑا خوش بخت ثابت ہوا ہے، پتا ہے دودن سے فارغ بیٹھا تھا میں۔ کوئی مر کر ہی نہیں دے رہا تھا ساری بستی میں۔ چل آجا شاباش، ہمیں گھنٹے بھر میں قبر تیار کرنی ہو گی، وہ لوگ دوپہر کی نماز کے بعد آئیں گے“۔ میں کسی معمول کی طرح کام میں جُت گیا۔ فقیرا اپنے کام کا ماہر تھا، جلد ہی اس نے چھ فٹ گہری قبر کھود کر مغرب کی جانب لحد تیار کر لی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے مٹی اٹھواتا اور قبر کی تیاری کے آزمودہ نسخے بھی بتاتا جا رہا تھا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میں نے دینی کے ابتدائی ایام میں اس سے کہیں زیادہ سخت محنت مزدوری کی تھی، مگر درمیانی عرصے میں مشقت کی عادت مجھ سے چھوٹ گئی تھی، لیکن میں فقیرے کے ساتھ جُتا رہا۔ میں خود کو اس قدر تھکا دینا چاہتا تھا کہ جسم کی ٹوٹتی رگوں سے میرے ماضی کی یادوں سمیت میری جان بھی قطرہ قطرہ بہہ کر نکل جائے۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ آ گیا، مرحوم کے ورثاء نے روتے دھوتے افسردہ اور سو گوار ماحول میں لاش کو قبر میں اتارا اور سب نے مٹی ڈالنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ فقیرا اس تمام عرصے میں ایک جانب لاطعلق سا بیٹھا بیڑیاں پھونکتا رہا، مگر یہ رات والی ”خاص“ بیڑی نہیں تھی۔ میں بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ فقیرے نے مجھے گھنٹی ماری۔ ”ابھی دیکھنا کچھ ہی دیر میں ان روتے دھونے والوں میں سے سگریٹ پینے والے دھیرے دھیرے ایک جانب سر کننا شروع ہو جائیں گے اور ایک دو کی ٹولیوں میں کھڑے ہو کر سگریٹ، بیڑی پھونکیں گے اور اپنے کاروبار کی باتیں شروع کر دیں گے“۔ اور پھر کچھ دیر میں واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ وہ مُسکرایا۔ ”برسوں سے دیکھ رہا ہوں یہ ڈراما..... سگریٹ ایسی بلا ہے، جو موت بھی بھلا دیتی ہے اور تجھے اب کیا بتاؤں اکبرے، میں نے تو یہاں جنازے پر بھی نشے میں دھت لوگوں کو آتے دیکھا ہے، کم بخت کہیں بیٹھے پی رہے ہوتے ہیں کہ کسی اپنے کی موت کا پیغام آ جاتا ہے، بھاگے دوڑے قبرستان تو پہنچ جاتے ہیں، آخری منہ دکھائی کے لیے، مگر قدم زمین پر نہیں پڑتے ٹھیک طرح“۔ میں نے فقیرے کے ہاتھ میں پکڑی بیڑی غور سے دیکھی۔ ”تم بھی تو سارا دن یہ دھواں اندر اندر لیتے رہتے ہو، میں نے سنا ہے اس سے کینسر ہو جاتا ہے“۔ فقیرے نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ ”تُو بھی ان جاہلوں کی باتوں پر یقین کرتا ہے اکبرے، میری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہے، پندرہ سال کی عمر میں میں نے پہلا کش لگایا تھا، یقین کر آج تک کبھی زکام بھی نہیں ہوا مجھے، جب کہ میں نے اسی قبرستان میں اپنے ہاتھوں سے ایسے تیس پینتیس سال کے جوان مردے بھی دفنائے ہیں، جنہوں نے عمر بھر تمباکو کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور اُن کے ساتھ آنے والے اس بات پر حیران تھے کہ نہ تو سگریٹ پیتا تھا، نہ شراب، پھر اچانک ہی کیسے گزر گیا۔ اب بول کیا بولتا ہے، تیرے حساب سے تو مجھے کب کا کینسر سے مر جانا چاہیے تھا“۔ میں لا جواب ہو گیا۔ ”تو پھر یہ ہر سگریٹ اور بیڑی کے پٹے پر موت کا ڈراوا کیوں لکھ دیتے ہیں؟“ فقیرے نے دبا دبا سا قہقہہ لگایا تا کہ اس کی آواز قبر پر مٹی ڈالتے ورثاء تک نہ پہنچے۔ ”مجھے تو یہ بھی کچھ بڑوں کی دکان داری لگتی ہے اکبرے! یہ کیا بات ہوئی بھلا زہر ہے، تو پھر بیچتے کیوں ہیں گھلے بازار میں، بند کر دیں اس کی فروخت“۔ مرحوم کے ورثاء دعا سے فارغ ہو کر دھیرے دھیرے پلٹ رہے تھے۔ قبر پر عطر، کیوڑے اور گلاب کی پٹیوں کا چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ فقیرے نے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ ”اب کچھ دن تک اس قبر کے اوپر بڑی رونق رہے گی، روزانہ کچھ لوگ آئیں گے، پھر دھیرے دھیرے ویرانی چھا جائے گی، سب اپنی اپنی دنیا داری میں الجھ کر یہاں سوئے شخص کو بھول جائیں گے، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے اکبرے.....!“

شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل فقیر بازار سے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کا بہت سا سامان اور تازہ بیڑی کے کچھ بٹڈل تھے۔ اس نے کچھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ”یہ تیری مزدوری کا حصہ ہے، آدھے پیسوں کا میں سامان لے آیا ہوں۔“ میں نے وہ روپے دوبارہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ ”یہ تم ہی رکھو، اب مجھے ان کی ضرورت نہیں پڑتی۔“ فقیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔ ”تُو بھی پورا ملنگ ہے، چل ٹھیک ہے، میرے پاس ہی جمع رہنے دے۔“ رات ڈھلی تو باہر قبرستان میں کچھ فاصلے پر عجیب سی جنت منتظر پڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ فقیر اچھونپڑی کے باہر بیٹھا بیڑی پھونک رہا تھا۔ ”یہ آوازیں کیسی ہیں؟“ فقیر نے حسبِ عادت بلاوجہ قہقہہ لگایا۔ ”کوئی عامل کسی زنانی کو بے وقوف بنانے کے لیے مثر پڑھ رہا ہے۔“ میں نے دُور اندھیرے میں دیکھا تو واقعی کوئی جعلی پیر نما شخص چنچہ پھنچہ دو تین عورتوں سمیت ایک قبر کے گرد بیٹھا آگ جلائے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ”یہ سب کیا ہے فقیر.....؟“ ”یہ عورت اپنے شوہر کے ظلم سے پریشان ہے اور اپنی سو کن کو اسی قبرستان میں پہنچانا چاہتی ہے، لہذا اس نے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مل کر اس عامل کو کالے عمل کے لیے رقم دی ہے، یہ بے وقوف عورتیں گھر سے ٹھپ کر یہاں آئی ہیں اور رات بھر میں اچھی خاصی رقم اس ڈھونڈنے کو پکڑا کر واپس چل دیں گی۔“ میں نے حیرت سے فقیر کو دیکھا۔ ”مگر تم اپنے قبرستان میں یہ ڈرامے بازی کیوں ہونے دے رہے ہو؟“ ”اوئے اکبرے! تُو واقعی بڑا بھولا ہے، جھٹلے ایہ عامل مجھ سے پہلے ہی سودا کر چکا ہے، آدھے پیسے میری جیب میں آئیں گے۔ کبھی کبھی تو ان جھوٹے عاملوں کے کہنے پر میں خود ہی کسی پرانی قبر میں لیٹ جاتا ہوں اور ان کے عمل کے بیچ میں منہ سے ڈراؤنی آوازیں نکالتا ہوں، تاکہ باہر بیٹھے لوگ اپنے پیر صاحب کی ”کرامت“ کا یقین کر لیں، یاد رکھ اکبرے، قبرستان میں جو بھی دھندا ہوتا ہے، اس کا آدھا حصہ قبرستان کے رکھوالے اور گورکن کو جاتا ہے۔“ میں حیرت سے منہ کھولے فقیر کے کی باتیں سن رہا تھا۔ میں تو جیتے جاگتے انسانوں کی دنیا کے پھندوں اور مکر و فریب کے جال کو رو رہا تھا، مجھے کیا پتا تھا کہ یہاں مردوں کی بستی کے بکھیرے زندوں سے بھی نرالے ہیں۔ اُس رات فقیر نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پرانی اور خالی قبریں باقاعدہ نشے باز اور جوار یوں کو کرائے پر دی جاتی ہیں، تاکہ وہ رات بھر اپنا شغل اطمینان سے جاری رکھ سکیں۔ علاقہ حوالدار بھی حصہ ملنے کے بعد یہاں کا رُخ نہیں کرتا۔ جعلی عامل اور پیر اپنے نئے گراہکوں پر اثر اور رعب ڈالنے کے لیے پہلی ملاقات ہی میں انہیں اپنے ڈیرے سے سیدھا فقیر کے قبرستان بھیج دیتے ہیں کہ جا کر فلاں قبرستان کی فلاں قبر کے سرہانے کھدائی کرو، تمہارے خلاف دبایا گیا تعویذ یا سفلی عمل وہیں ملے گا۔ ضرورت مند بے چارہ بھاگا بھاگا قبرستان آتا ہے، جہاں فقیر پہلے ہی سے کسی کالی مرغی کا سر، سڑے ہوئے انڈے یا کسی بکرے کی سری دبچا ہوتا ہے۔ سائل اپنے عامل کی کرامت کا بھرپور نظارہ دیکھ کر اپنی غم بھر کی پونجی عامل پر ٹھانڈا دیتا ہے اور فقیر کے حصہ اُسے مل جاتا ہے۔ ”میں دن بھر بیٹھا حیرت سے فقیر کے کی باتیں سنتا رہا۔“ ہر جا جہاں دیگر ”کا مطلب مجھے اب سمجھ آ رہا تھا۔ میرا دن تو ان سب روزمرہ کی مصروفیات میں گزر جاتا تھا اور میں خود کو شدید حد تک تھکانے کے لیے فقیر کے حصے کا کام بھی خود کرنے لگا تھا، مگر رات کاٹے نہیں کتنی تھی۔ اچانک ہی کسی پہرہ میری آنکھوں کے درپے کھول کر میرے دل کے آگن میں آ کر بیٹھ جاتی، میں لاکھ خود کو چمپاتا، اپنی آنکھیں میچ لیتا، مگر وہ مجھ سے ہم کلام رہتی۔ مجھے اپنے شب و روز بتاتی، میری کرخت انگلیاں، کدال اور بیلچہ چلانے سے کھر درے چھالوں بھرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتی اور مجھ سے شکوہ کرتی کہ میں اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہوں، پھر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور جھونپڑی سے باہر نکل کر ساری رات تارے گنتا رہتا۔

ایک ایسی ہی رات فقیر ابھی میری آہٹ پر باہر آ گیا۔ ”کیا بات ہے اکبرے! تُو سوتا کیوں نہیں ہے، کوئی پریشانی ہے، تو مجھے بتا، جوان جہاں بندہ ہے تُو، کہیں کوئی عشق و شوق تو نہیں ہو گیا تھے.....؟“ میں مُسکرا دیا۔ ”کیوں کیا وہ سارے جو راتوں کو جاگتے ہیں، ان سب کو عشق کی بیماری ہوتی ہے کیا؟“ فقیر ابھی ہنس پڑا۔ ”ہاں اپنا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ جوانی کے یہ رت جگے عشق کا نتیجہ ہوتے ہیں، تُو شادی کیوں نہیں کر لیتا، کب تک یوں اکیلا در بدر خوار ہوتا رہے گا؟“ ”اور اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی، تو پھر.....؟“ ”فقیر نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”اونٹیں یار.....! یہ زنانیاں بڑی مظلی ہوتی ہیں، ان سے بندہ دُور ہی رہے تو اچھا ہے، میں نے تو آج تک یہی دیکھا ہے کہ دنیا میں جتنے مسئلے ہوتے ہیں، انہی کی وجہ سے ہوتے ہیں، اچھا خاصا مرد اُن کے چکر میں نہ دین کا رہتا ہے، نہ دنیا کا۔“ میں نے غور سے افسردہ فقیر کو دیکھا۔ ”پھر تو میرا شک سولہ آنے سچ ہے کہ تم نے بھی کبھی کسی سے بھرپور عشق کیا ہے فقیر.....“ ”ورنہ یوں غم زدہ نہ بیٹھے ہوتے۔“ فقیر نے تازہ بیڑی سلگائی۔ ”کیوں دل پشوری کرتا ہے اکبرے، ہاں تھی ایک..... یہیں قبرستان میں ملاقات ہوئی تھی، جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی، میں نے اس پر بڑا خرچہ کیا، ہر مشکل وقت میں سہارا دیا، پر جیسے ہی اسے مجھ سے بہتر بندہ ملا، دوبول نکاح کے پڑھوا کر جانے کہاں چلی گئی، پلٹ کر پوچھا بھی نہیں مجھ سے۔ بس، اُسی دن سے میرا ان عورتوں سے اعتبار اٹھ گیا، میری بات کان کھول کر سن لے اکبرے، یہ زنانیاں کسی کی نہیں ہوتیں، کبھی ان کے چکر میں نہ پڑنا۔“ اب میں اسے کیا بتاتا کہ یہ واردات مجھ پر جانے کتنی مرتبہ بیت چکی ہے۔ اگلی رات دُور کسی قبر کے سرہانے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اگرچہ میں ان باتوں کا بہت حد تک عادی ہو چکا تھا، مگر آوازیں اتنا درد تھا کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں کنیا سے باہر نکلنے لگا تو فقیر نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ”باہر نہ جا اکبرے! کوئی دکھاری ہے، قبر پر چلہ کانٹے آئی ہے اولاد کے لیے۔“ میں نے حیرت سے فقیر کو دیکھا۔ ”مگر قبر پر چلہ کانٹے سے بے اولادی کیسے دُور ہو سکتی ہے؟“ ”فقیر نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تُو سمجھتا کیوں نہیں، یہ سارے کم زور عقیدے کے لوگ ہیں، میں نے تو یہاں عورتوں کو اولاد کی خواہش میں کسی نومولود بچے کی قبر پر نہانے کا نسخہ لے کر آتے بھی دیکھا ہے، بس جو ہو رہا ہے، اسے ہونے دے۔ ہم ان کو یہاں آنے سے روکیں گے، تو یہ کسی اور قبرستان چلے جائیں گے۔ تُو چپ کر کے سو جا۔“ میں نے زمین پر سر ٹکالیا، مگر میرا دھیان اب بھی باہر تھا۔ ”فقیر.....! کیا تم نے کبھی کوئی اچھی بات نہیں دیکھی اس قبرستان میں؟“ ”ہاں بالکل دیکھی ہے، ایک بار کسی اللہ والے کو دفنا گئے تھے، لوگ یہاں۔ پتا نہیں، کتنے دن اس کی قبر سے تازہ گلاب کی خوشبو آتی رہی اور کبھی کبھی تورات کے اندھیرے میں مجھے وہ قبر بہت نورانی بھی محسوس ہوتی تھی، جیسے روشنی نکل رہی ہو اندر سے، اور کبھی کبھی کسی گناہ گار کی قبر سے عذاب کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی ہیں۔ دیکھ اکبرے..... قبر میں جانے کے بعد بندے کا رابطہ ڈائریکٹ اس کے رب کے ساتھ ہو جاتا ہے، پھر میرے تیرے جیسے گناہ گار انسانوں کو ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے، سو جا چپ کر کے، کل صبح فجر کے بعد ہی ایک قبر کھودنی ہے، تجھ کی رقم ملے گی ان شاء اللہ۔“

اگلے روز فقیر کہیں سے اخبار اٹھا لایا۔ ”چل بھئی اکبرے، منذوا دیکھنے چلتے ہیں۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”منذوا.....؟“ ”ہاں یار! وہ کیا کہتے ہیں سنیم، یہ دیکھ بڑی زبردست پکچر لگی ہے بازار والے سنیم میں۔“ میں نے اخبار پر نظر دوڑائی تو میرے ہاتھ کپکپا سے گئے۔ لبتی کی فلم ریلیز ہو چکی تھی اور سُر ہٹ ہو کر سلور جوبلی منانے کو آئی تھی۔ میں بہت دیر تک فلم کی خبریں پڑھتا رہا۔ اسے لبتی عرف شہ پارہ کے کیریئر کی بہترین فلم قرار دیا جا رہا تھا۔ شہ پارہ کا انٹرویو بھی ٹھپا تھا، جس میں اس نے کھل کر مجھے یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ پری زادنہ ہوتا تو یہ فلم کبھی بن ہی نہ پاتی۔ اس نے میرے لیے پیغام بھی چھوڑا تھا کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں، یہ جان لوں کہ شہ پارہ کا خواب پورا ہو گیا ہے اور اس نے پری زاد کو اپنا خواب گر، اپنا سب سے بڑا محسن قرار دیا تھا۔ میں ایک دم بہت اداس ہو گیا۔ میں نے فقیر کے کوا کیلے فلم دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ فلمیں وہ لوگ دیکھتے ہیں، جو خواب دیکھنا جانتے ہوں، وہ اپنے کسی خواب کو سنیم کے پردے پر جیتا جاگتا دیکھنا چاہتے ہیں، مگر میرا تو کوئی خواب ہی نہیں بچا تھا، سب سنے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکے تھے، میں بھلا اب اس قابل ہی کہاں تھا کہ کوئی خواب دیکھ سکتا۔ فقیر کے جانے کے بعد میں نے سارے اخبار کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ مجھے گھر چھوڑے ہوئے چھ ماہ سے زائد ہو چکے تھے، مگر اخبار کو دیکھ کر لگتا تھا، جیسے کل کی بات ہو۔ وہی بزنس اور کاروبار کی خبریں، وہی جھگڑے فساد کی باتیں، وہی شادی، بیاہ کی تقریبات، وہی دنیا فتح کر لینے کے دعوے..... کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ہم انسان کتنے بھولے ہوتے ہیں، جو یہ سوچ لیے

بیٹھے ہوتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی سب کچھ رُک جائے گا یا بدل جائے گا، مگر کچھ نہیں رکتا، کچھ نہیں بدلتا۔ سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے، بس ہم نہیں ہوتے۔ گویا ہمارا ہونا نہ ہونا سب برابر ہے، تو پھر اس نہ ہونے کے برابر ہونے کا اتنا زعم کیوں، اتنا گھمنڈ کس لیے.....؟ مجھے پھر اس دھمن جان کا خیال ستانے لگا۔ اب تک تو اس کی پینائی واپس آچکی ہو گی، جانے وہ واپس آنے کے بعد مجھے یاد بھی کرتی ہو گی کہ نہیں۔ میں آتے وقت دفتر اور گھر سے اپنی ہر ممکن تصویر جلا کر وہاں سے نکالتا تھا، تاکہ جب کبھی عینی واپس آئے تو اسے میری کوئی بھی صورت دکھائی نہ دے جائے۔ ویسے بھی میں شروع ہی سے تصویریں کھینچنے سے گریز کرتا تھا۔ وہ ایک بار تو ضرور میرے گھر یا دفتر آئی ہو گی اور اس کی آنکھوں نے مجھے وہاں کھو جا بھی ضرور ہو گا۔ کیسی دکھتی ہوں گی، اس کی وہ کھوجتی ہوئی آنکھیں..... اس نازنین نے میرے دفتر اور گھر کے نرم قالین پر اپنے نازک قدم رکھتے ہوئے میرے زیر استعمال چیزوں کو چھوا بھی ضرور ہو گا۔ پھر وہ عدنان کے شانے پر سر رکھ کر بہت دیر روتی رہی ہو گی، مگر عدنان نے اسے سنبھال لیا ہو گا۔ اس کی کومل جبین کو عدنان کا شانہ ہی چٹتا تھا۔ میری اس بے وقعت زندگی کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ میں کسی طور اس کی یادوں میں زندہ رہوں۔ کہ میں تمہارے ہی دم سے زندہ ہوں..... مری جاؤں، جو تم فرصت ہو۔

مگر مجھ جیسے کم نصیبوں کو مرنے کی فرصت بھی کہاں میسر تھی۔ دن، ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے اور پھر ایک دن فقیر اصبح سویرے کسی کام سے بازار گیا تو شام تک واپس نہ لوٹا۔ میں جھوپڑی کے باہر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک پولیس کی پرائی ویز جیپ قبرستان میں داخل ہوئی اور میرے قریب آ کر رُک گئی۔ خاکی رنگ کی جیپ سے دو سپاہی نیچے اترے اور ان میں سے ایک نے حسبِ عادت کڑک کر مجھ سے پوچھا۔ ”اکبر تیرا ہی نام ہے؟“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”ہاں، سب خیر تو ہے.....؟“ ”خیر نہیں ہے، تیرے ساتھی فقیرے پر ساتھ والے چھوٹے قبرستان کے گور کن سلاے اور اس کے دوستوں نے حملہ کر دیا ہے، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے، جلدی چل، وہ تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“ میں بوکھلایا سا اُن کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ پولیس والوں کی آپس میں بات چیت سے مجھے پتا چلا کہ ان دونوں کی بہت پرائی دشمنی چل رہی تھی، قبرستان کی حد بندی پر، اور آج فقیر، سلاے اور اس کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ ہم اسپتال پہنچے تو فقیر آخری سانس لے رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”دیکھ لے اکبرے! قبرستان کے دھندے نے قبر تک پہنچا دیا، پر ٹو ایسی غلطی نہ کرنا، بندہ جتنی بھی حد بندیاں کر لے، اس کی آخری حد اس کی قبر ہی ہوتی ہے۔“ فقیر ادھر سے دھیرے دھیرے غنودگی میں چلا گیا اور پھر دوبارہ کبھی ہوش کی دنیا میں واپس نہیں آیا۔ سلاہ اور اس کے ساتھی قتلِ عمد کے جرم میں پکڑے گئے اور سرکاری وکیل نے عدالت کے ذریعے انہیں سولی تک پہنچانے کا پورا بندوبست کر لیا۔ فقیرے کو اسی کی جاگیر، قبرستان کی چھوٹی سی قبر میں اتار دیا گیا۔ میرا جی اچاٹ ہو گیا اور فقیرے کے چالیسویں کے بعد میں نے اپنی پوٹلی اٹھائی اور اسٹیشن سے پہلی گاڑی پکڑ لی، پھر سے وہی سفر اور وہی انجان رستے.....! مگر میری حالت روز بہ روز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ جاڑے کا اثر تھا یا پھر مسلسل برسات کا، مگر میرا بدن تنے لگا اور پھر شدید تیز بخار نے مجھے آگھیرا۔ مجبوراً مجھے ایک چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر اترنا پڑا۔ فقیر مجھے ملنگ کہہ کر چیخڑتا تھا، مگر اب میرا حلیہ اور میری ظاہری حالت واقعی کسی ملنگ سے بھی بدتر تھی۔ رات ڈھل رہی تھی اور اسٹیشن ویران پڑا تھا۔ مجھے شدید سردی لگ رہی تھی، لہذا میں نے اپنی پرانی چادر کی بگل مار کر خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دُور چائے کے ٹھیلے پر گرم گرم چائے بن رہی تھی۔ ٹھیلے پر بد نما سی لکھائی میں لکھا تھا ”خانو کی چائے، ہر غم بھگائے“ ٹھیلے والے نے مجھے ٹھٹھرتے دیکھا تو ایک کپ چائے لے کر میرے قریب آ گیا۔ ”چائے پیو گے؟“ میں نے انکار کیا۔ ”نہیں مجھے طلب نہیں ہے۔“ ٹھیلے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”عجب بھکاری ہو، بھئی میں خود اپنی مرضی سے دے رہا ہوں، تجھ سے پیے نہیں مانگ رہا خانو!“ میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بھکاری.....؟ ہاں ٹھیک کہا تم نے، میں بھکاری ہی ہوں، بہت بھیک مانگی ہے میں نے ساری زندگی، پر کچھ نہیں ملا..... اب کچھ چاہیے بھی نہیں، جاؤ مجھے تنگ مت کرو۔“ خانو جانے میری ڈانٹ کو کیا سمجھا کہ اس کا لہجہ ایک دم عاجزانہ ہو گیا۔ ”معاف کرنا سائیں! تم تو کوئی اللہ لوک ہو، مجھ سے گستاخی ہو گئی۔“ میں نے اسے جھاڑ دیا۔ ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو، میں کوئی سائیں نہیں ہوں، اکیلا چھوڑ دو مجھے!“ خانو نے جاتے جاتے بھی تین بار مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے تھک کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگالی، جس کے تنے کے ارد گرد پگلی اینٹوں اور سینٹ کا چوبارہ اٹھا کر ایک گول پلیٹ فارم سا بنادیا گیا تھا۔ پھر مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب مکمل بے سدھ ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو سورج کی تیز کرنوں نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ میرے ارد گرد لوگوں کی بھیڑا کٹھی تھی اور وہ سب آپس میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر خانو نے سب کو ڈانٹ کر ایک طرف سمیٹا۔ ”چلو بابا.....! کیا بھیڑ لگا رکھی ہے..... جو گی بابا کو ہوش آ گیا ہے، شاید لمبے مراقبے میں چلے گئے تھے۔“ میں نے چونک کر آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رفقاء، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولے گا۔ ہمارا ہوا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

وہ سب ہاتھوں میں مچھلوں کے ہار لیے یوں سر جھکائے میرے ارد گرد دائرے میں کھڑے تھے، جیسے میں کوئی پیر، ولی یا بزرگ ہوں۔ میں گھبرا کر کھڑا ہوا اور نقاہت سے چکرا گیا۔ میرے ڈمگاتے جسم کو تھامنے کے لیے کئی ہاتھ بہ یک وقت آگے بڑھے، تو میں نے سب کو جھٹک دیا۔ ”تم لوگوں کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، جاؤ یہاں سے، مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ خائونے دوبارہ سب کو جھاڑا، جیسے وہ میرا نائب ہو۔ ”منا نہیں بابا! جاؤ یہاں سے ابھی۔ سائیں جلال میں ہے۔“ لوگ عقیدت سے سلام کرتے وہاں سے بادل خواستہ ٹھٹھنے لگے۔ خائونے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے پوچھا۔ ”کھانا کھاؤ گے سائیں؟“ میرا صبر جواب دے گیا۔ ”آخر تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟“ خائونے مننایا۔ ”آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں سائیں! شاید آپ کی دعا سے خائو کے دن پھر جائیں۔ پچھلے سال باڑھ میں میرا سب کچھ بہہ گیا تھا۔ ادھر ٹرینوں کی بد حالی نے بھی دھندامندا کر دیا ہے سائیں۔“ میں نے جھنجھلا کر اسے دھتکارا۔ ”جاہل انسان! تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے۔ میں کوئی پیر فقیر نہیں ہوں، اگر میری دعا میں اثر ہوتا، تو آج میں خود یوں در بدر خوار نہ ہوتا۔“ مگر خائو ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر کب تک ہم ظاہر پرست انسان بیرونی ٹیلے اور لباس کی بنیاد پر لوگوں کے دُہدو تقویٰ کا فیصلہ کرتے رہیں گے؟ سر اور داڑھی کے بے تحاشا بڑھے بال، چہرے اور لباس پر وقت کی دُھول اور غم کی ٹھکنیں، چادر پر درد کی سلوٹیں اور جھولی میں ناکامیوں کے کیکر اور کانٹے..... کیا کسی جوگی کا یہ حلیہ کافی ہوتا ہے، اُسے درویش ثابت کرنے کے لیے؟ میں نے جان ٹھنڈانے کے لیے بے زاری سے کہا۔ ”اگر تمہاری تسلی میری دعا ہی سے ہوتی ہے، تو جاؤ میں نے تمہیں دعا دی۔“ خائو کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر جانے کیا کیا منگتیں مانگتا وہاں سے ٹل گیا۔ میں نے تھک کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ ان چھوٹے دیہات، قصبوں کے لوگ کتنے سادہ لوح ہوتے ہیں یا پھر شاید آج کا انسان اپنے غم کے ہاتھوں اس قدر ٹوٹا ہوا ہے کہ اُسے ہمیشہ کسی مسیحا کا انتظار رہتا ہے۔ کاش! انہیں کوئی سمجھا سکتا کہ میں مسیحا نہیں۔ اُن سے زیادہ دنیا داری کے داغوں سے مابرس کا وہ مریض ہوں، جو خود ”شفائے عشق“ کی تلاش میں زمانوں سے بھٹک رہا ہے۔ بہ مشکل ایک دن ہی سکون سے گزر پایا اور اگلی صبح جب میں اپنے بخار سے تپتے جسم کو ایک بوسیدہ سے کمرے میں لیٹے درخت کے نیچے لیٹا تھا، تب ہی اچانک وہی بے وقوف خائو دور سے ہاتھ میں نہ جانے کیا کاغذ پکڑے، لہراتا شور مچاتا میرے قدموں سے آکر لپٹ گیا۔ ”تم واقعی اللہ لوک ہو سائیں! کمال کر دیا ایک ہی رات میں، جیو سائیں..... جیو۔“ میں نے جلدی سے اپنے پیر لپیٹ کر اسے دھکا دیا۔ ”ہٹو پیچھے، یہ کیا کر رہے ہو؟“ خائو خوشی سے چلا یا۔ ”سائیں! یہ دیکھو، آپ کی دعا سے میرا دس ہزار کا بانڈ نکل آیا ہے۔ سارے دلزدہ دور ہو گئے، پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم میرے سائیں نہیں ہو۔ مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دو۔“ کچھ ہی دیر میں آس پاس تمام ریلوے اسٹیشن کے عملے تک یہ خبر پہنچ چکی تھی اور اگلے چند دنوں کے اندر میری زندگی میں نت نئے عذابوں کا ایک دور شروع ہو گیا۔ میرے ارد گرد قریب اور دور دراز کے سادہ لوح دیہاتیوں کا ایک ہجوم جمع رہتا، جو میرے قدموں میں دس، بیس اور پچاس کے نوٹ نذرانے کے طور پر پھینک کر نہ جانے کون کون سی منگتیں پوری کرنے کی دعائیں مانگتے رہتے۔ میں جتنا ان لوگوں کو دھتکارتا اور قدموں میں پڑی اس ریزگاری کو لات مارتا، اتنا ہی ان کی نظر میں معتبر ٹھہرتا۔ میرے بخار اور نقاہت نے مجھے اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ میں کسی رات منہ اندھیرے چپ چاپ وہاں سے کسی اور منزل کی جانب نکل جاؤں، لیکن میں جاتا بھی تو کہاں جاتا؟ ہر طرف اُسی انسان کا سامنا تھا مجھے۔ اور بھلا انسان سے بڑا امتحان اور کیا ہو گا اس جہاں خراب میں۔ خائو مجھے اس بھیڑ کے ہاتھوں آزار میں مبتلا دیکھتا تو ڈانٹ ڈپٹ کر لوگوں کو

وہاں سے ہٹا دیتا، مگر دو چار گھنٹے بعد پھر وہی ہجوم، پھر وہی بھانت بھانت کے انسان اور ان کی عجیب و غریب فرمائشیں، کوئی عورت ڈھائی دیتی۔ ”سائیں! میری بہو، بیٹا نہیں جلتی، چار لڑکیاں اوپر تلے سینے پر مونگ ڈل رہی ہیں، دعا کرو اس بار بیٹا ہو جائے۔“ کوئی دوسرا کہتا۔ ”بیٹے کو نو کری نہیں ملتی جوگی سائیں! بس، ایک نو کری ولادو۔“ تیسری جانب سے ایک اور آواز آتی۔ ”بس ایک دکان کا سوال ہے سائیں، کاروبار بھادو۔“ میں آنکھیں بند کیے منہ لیٹے پڑا رہتا اور وہ میری خاموشی ہی کو میری دعا سمجھ کر کچھ دیر رونے دھونے کے بعد اٹھ کر چلے جاتے۔ اُن میں سے کوئی نہ جانے کب لکڑی کی ایک تختی پر خلی حروف میں ”آستانہ جوگی سائیں“ لکھوا کر لے آیا اور تختی کو درخت کے ایک اونچے حصے پر کیل سے ٹھونک گیا۔ وہ لوگ میری نقاہت اور بیماری کو میرا روزہ یا فاقہ سمجھتے تھے اور میری مردم بے زاری کو پیری فقری کی نشانی، اوپر سے قدرت بھی عجب طرح مہربان تھی۔ میرے ارد گرد موجود لوگوں کے جنگلے میں سے کسی نہ کسی کی مراد بر آتی اور وہ اُسے میری ”کرامات“ کے کھاتے میں ڈال دیتا۔ سو میں سے باقی اُن ناوے ناکام، مرادوں کو کوئی نہیں گنتا تھا، جو کبھی پوری نہیں ہو پاتی تھیں۔ کالی رات کے گھپ اندھیرے میں ایک معمولی دیا سلائی بھی دُور سے جلتی نظر آ جاتی ہے۔ آس پاس بکھری تاریکیوں پر کوئی نظر نہیں ڈالتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ وہاں سے چپ چاپ اٹھ کر کسی روز اسٹیشن سے گزرتی کسی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں دُور نکل جاؤں۔ ایک آدھ بار نظر بچا کر اسٹیشن سے باہر سڑک پر بھی نکل آیا، مگر یہ جوگی سائیں کا لقب اور حلیہ آس پاس اور دُور دراز کے علاقوں میں میری کچھ ایسی پہچان بن چکا تھا، جیسے قیدی کے بیروں میں بیڑیاں یا کسی پیدا انٹی غلام کے ماتھے پر گھدی کوئی سیاہ مہر۔ میں جہاں بھی جاتا، میری پیشانی پر ثبت یہ غلام کی مہر لوگوں کو میرے ارد گرد اکٹھا کر دیتی، میرا دم گھٹنے لگتا، میں گھبرا کر انہیں جھڑکتا، دُور ہٹاتا، وہ میرے ارد گرد آتے اور تھک ہار کر میں واپس اُسی آستانے کی راہ لیتا، جہاں سے یہ مہر غلامی میری جبین پر کندہ کی گئی تھی۔ ایک آدھ بار کسی ویرانے کی راہ بھی اپنائی، مگر مجھ جیسے سیاہ بختوں کو ویرانہ بھی راس نہیں آتا۔ وہاں میری خبر زیادہ تیزی سے پھیلتی اور پھر جمع ہوتی خلقت کی وجہ سے اس ویرانے کی حرمت بھی مجروح ہو جاتی تھی۔ میں دنیا کو دھتکارتے دھتکارتے تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا، جب انسان اسے اپنانا چاہتا ہے، یہ اسے دھکے دے کر دُور بھگاتی ہے، خوار کرتی ہے، ہر پل سسکا کر تڑپاتی ہے، مگر جب وہی انسان دنیا سے بے زار ہو کر اسے لات مارتا ہے اور کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتا ہے، تب یہی دنیا خود اس کے قدموں سے لپٹ کر منگتیں، ترلے کرتی ہے کہ اسے ٹھکرا کر نہ جائے۔ اور پھر مجھ جیسوں کا سفر بھی بھلا کیا سفر تھا، میرے لیے تو سب علاقے، جگہیں، لوگ، موسم اور رویتے، سب ہی ایک جیسے تھے۔ کم از کم خائو والے ریلوے اسٹیشن پر میرے پوشیدہ رہنے کے لیے ایک بجیس تو موجود تھا، لہذا مختلف علاقوں کی خاک چھاننے کے بعد میں دوبارہ اسی جگہ پہنچ گیا، جس کی مفتی سے میرے اس نئے بہروپ کا خیر اٹھایا گیا تھا۔ مجھے واپس وہاں پا کر سارے اسٹیشن پر

جشن سا برپا ہو گیا۔ اُداس بیٹھے خائونے نعرے لگا لگا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ ”سائیں! کیا بتاؤں تم کو، جب سے تم روٹھ گئے ہو۔ سارا دھندامندا ہو گیا ہے۔ سب پریشان ہیں، کہتے ہیں سائیں کی برکت اٹھ گئی ہے یہاں سے، اسی لیے کال پڑ گیا ہے، مگر اب یہ ویرانی دُور ہو جائے گی۔ بس سائیں، اب ہم سب کا بیڑہ پار ہے۔“ میں چپ چاپ بیٹھا اس بے وقوف کی داستان سُنتا رہا۔ دوسرے روز ہی علاقے کی ایک پُرانی بند ٹرین پھر سے رواں کر دی گئی، ہجوم بے قابو سا ہو گیا۔ عجب مداری بنا کر رکھ دیا تھا اس تقدیر نے بھی۔

میں سارا دن سر جھکائے درخت تلے بیٹھا رہتا اور لوگ آتے جاتے رہتے۔ ایسی ہی ایک گرم دوپہر جب پرندے بھی آگ برساتے سورج سے بچنے کے لیے اپنے ٹھکانوں میں پڑ سیٹے بیٹھے تھے، پلیٹ فارم پر اچانک ہلچل سی مچ گئی۔ پتا چلا کہ علاقے کے سب سے بڑے زمین دار کی تیسری نئی نویلی دُہن اپنی خادماؤں اور خاص کارندوں کے ٹھہر مٹ میں تشریف لائی ہیں۔ نو کرانیوں نے نذر نیاز کی پراتیں میرے

قدموں میں رکھ دیں اور غلاموں نے ارد گرد لگی بھیڑ کو جھڑک کر پڑے بھگا دیا۔ لڑکی نوجوان بھی اور اس کو سب ”چھوٹی سرکار“ کے نام سے پکار رہے تھے۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں سر نہجکائے بیٹھا رہا۔ اس کی چوڑیاں کھنکیں۔ ”میرا نام گل ناز ہے جو گی سائیں..... رب کا دیا سب کچھ ہے، پر گودا بھی سونی ہے۔ آپ کی ایک نظر چاہیے۔“ اس کی نرم و ملائم آواز پر میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ اسم بامسمیٰ تھی، اپنے نام کی طرح، جس پر پھول بھی رشک کریں، وہ گل ناز تھی۔ سنہری دکتارنگ، آنکھوں میں کاجل اور ناک میں سونے کالونگ، سیاہ کڑھی ہوئی شال لپیٹے وہ خود گلاب کا پھول لگ رہی تھی۔ پل بھر ہی میں مجھے اس کے حسین چہرے میں سب سے پہلے ناہید، پھر لبٹی، لیلیٰ، صبا اور عینی کا چہرہ جھلکتا نظر آیا۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ”نہیں، اب اور نہیں..... بس..... عورت، چلی جا یہاں سے، جا، پھر کبھی اپنی صورت نہ دکھانا مجھے۔“ گل ناز ڈر کر پیچھے ہٹی، تو خانو دُور سے بھاگتا ہوا آیا۔ ”جو گی سائیں جلال میں آ گیا ہے چھوٹی سرکار۔ بس سمجھو، آپ کی مراد پوری ہوئی۔“ لڑکی ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔ ”اچھا؟ میں تو سمجھی کہ سائیں مجھ سے ناراض ہو گئے۔“ خانو نے بڑے رُعم سے جواب دیا۔ ”یہی تو بات ہے ہمارے سائیں کی۔ عورت اور پیسے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، مگر آج تک جس کو بھی سائیں نے ڈانٹا، اس کی نیا پار ہوئی۔“ گل ناز کچھ دیر مزید عقیدت سے ہاتھ جوڑے میرے قدموں میں بیٹھی رہی اور پھر دھیرے سے اُٹھ کر خراماں خراماں واپس چلی گئی۔ اگلے چند دنوں میں چاروں طرف یہ خبر پھیل چکی تھی کہ جو گی سائیں کو عورت اور خصوصاً خوب صورت عورت کے وجود ہی سے شدید نفرت ہے۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ حُسن کا یہی زہر تو ہے، جو ازل سے میری رگ رگ میں سرایت کر کے میری رُوح کو تمام عمر جھلساتا رہا ہے اور میں جل جل کر اتنی بار راکھ ہو چکا ہوں کہ اب کوئی چنگاری باقی نہیں رہی، پھر ایک دن ایک نوجوان جوڑا جھجکتے ہوئے میرے پاس آیا۔ لڑکی اور لڑکا دونوں کافی سہے ہوئے لگتے تھے۔ لڑکے نے بند مُٹھی کھولی اور پچاس روپے کا مُڑا تراسا نوٹ میرے قدموں میں ڈال دیا۔ ”ہمارے لیے دُعا کریں سائیں جی کہ ہماری شادی ہو جائے۔ ہم دونوں کے گھر والے ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ہمارا رشتہ ناممکن ہے۔“ میں نے ہنسوں کے اس جوڑے کی طرف دیکھا۔ ”صرف پچاس روپے میں شادی چاہتے ہو؟ اتنا سستا ہے تمہارا رشتہ.....؟“ لڑکا کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ ”میرے پاس تو فی الحال بس اتنے ہی ہیں۔“ میں نے نوٹ پڑے کر دیا۔ ”اتنے پیسوں میں جو گی سائیں شادی نہیں کرواتا۔“ لڑکے نے پریشان ہو کر لڑکی کی طرف دیکھا، لڑکی نے جلدی سے اپنے کانوں میں پہنی سونے کی بالیاں اتار کر میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ”لگتا ہے یہ تم سے زیادہ محبت کرتی ہے، یہ بالیاں واپس اٹھا لو لڑکی، محبت اگر بچی ہو تو بذاتِ خود دنیا کی سب سے بڑی دُعا بن جاتی ہے۔ واپس چلے جاؤ تم دونوں اپنے گھروں کو۔ اور اس اُمید کے ساتھ جاؤ کہ تمہاری محبت ہی تمہاری دُعا ہے، تمہاری منت اور تمہارا تعویذ ہے۔“ وہ دونوں یوں خوش باش اُٹھے، جیسے آج ہی ان کا رشتہ طے ہو گیا ہو۔ اُف یہ محبت کرنے والوں کی ”زُود فہمیاں.....“ محبت کرنے والے ہمیشہ ایک

دوسرے کو پانے کی دُھن میں کیوں سرگرداں رہتے ہیں۔ کاش! یہ نادان جان پاتے کہ دنیا میں کسی کا محبوب ہونا ہی کائنات کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ محبت کو تو محبوبیت سے غرض ہونی چاہیے، نہ کہ وصل یا وصال سے۔ کسی کا محبوب ہونا کتنا بڑا عہدہ و مرتبہ ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ مجھ جیسے تو اپنی تمام عُمر اسی مسند پر ایک لمحہ بیٹھنے کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اپنا سارا جیون جلا دیتے ہیں، مگر وہ پل بھر کے لیے بھی کسی کا محبوب نہیں بن پاتے۔ اور پھر میری طرح یہی ایک خواہش دل میں لیے ہمیشہ کے لیے خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

میرے خاک ہونے کے دن بھی قریب آرہے تھے، میری حالت اب زیادہ تر اتر رہنے لگی تھی۔ مجھے دن، تاریخ، مہینے اور سُن سے اب کوئی سروکار نہیں تھا، مگر دُور کھڑے خانو کے ٹھیلے پر بدلتے ریلوے کے لائنس سے اتنا پتا چل جاتا تھا کہ مجھے گھر چھوڑے پانچ سال سے بھی کچھ زائد عرصہ ہو چکا تھا اور پھر موسم نے کروٹ بدلی اور جاڑے کی سردی اور کبرے نے ماحول پر اپنا سفید غلاف لپیٹ دیا۔ میں رات بھر گیلے لُاف تلے بارش میں بھیگتا رہا اور نتیجہ اگلے روز صاف ظاہر تھا۔ خانو کسی کام سے مجھے اٹھانے آیا تو میرا ہاتھ جُھوتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ”اوہو..... تمہیں تو تیز تپ ہے سائیں۔ میں ابھی حکیم صاب کو لے کر آتا ہوں۔“ خانو اُلٹے قدموں واپس بھاگ گیا۔ میں نے آواز دے کر اُسے روکنے کی کوشش کی کہ اب یہ روگ حکیم، طبیب یا ویدوں کے بس سے باہر کی بات ہے، ڈاکٹر اور طبیب مرض کا علاج کر سکتے ہیں، مریض کا نہیں۔ خاص طور پر جب مریض مجھ جیسا ہو کہ جسے خود اپنے فنا ہونے کا انتظار سب سے زیادہ ہو، میں نے خود کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے، مگر یہ زندگی بھی اس دو غلی دنیا جیسی ہی تھی، جو اس سے جان چھڑانا چاہے، یہ اسی کے دامن سے لپٹی رہتی ہے۔ خانو گھنٹہ بھر بعد ہی کسی بزرگ حکیم کی جڑی بوٹیوں سے بنی دواؤں کا بکسہ ہاتھ میں تھامے دوبارہ نمودار ہو گیا۔ حکیم صاحب نے میری نبض دیکھ کر تشویش سے سر ہلایا۔ خانو غور سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ حکیم نے چڑے کے بکس میں سے چند سفوف نکالے اور یک جا کر کے تین چار پُڑیاں سی بنا دیں۔ ”یہ لو خانو میاں..... صبح، دوپہر، شام۔ دن میں تین تین مرتبہ سادے پانی میں گھول کر پلانی ہے یہ دوا۔ سردی لگ گئی ہے تیرے سائیں کو۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔“ خانو نے کسی تجربہ کار اور مستند تیماردار کی طرح میرے طبیب کی ساری ہدایات ازبر کر لیں۔ شاید غالب نے خانو جیسے ہم دردوں کے لیے ہی کہا تھا کہ: ”پڑیے گر بیمار..... کوئی نہ ہو تیماردار“ مگر میرا تیماردار کسی صورت میرا چچا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ جو میں ساری خلقت کو دعامیں بانٹتا پھر تا ہوں، خود اپنے لیے شفا یابی کی دُعا کیوں نہیں کرتا۔ حکیم نے جاتے جاتے میرا شانہ تھپتھپایا اور مُسکرا کر بولے ”فکر نہ کریں سائیں جی، جلد ہی بھلے چنگے ہو جائیں گے۔“ میری زبان بے ساختہ پھسل پڑی۔ ”کچھ مزید بیمار کرنے کی دوا بھی کرتے ہیں کیا آپ؟“ حکیم نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”نہیں، مجھے صرف شفا دینے کا حکم ہے۔ سو، اپنی سی کوشش جاری رکھتا ہوں۔ مگر لگتا ہے، یہ ہنر آپ نے خوب سیکھ رکھا ہے، پر تقدیر سے لڑنے کا کچھ فائدہ نہیں سائیں جی۔ جو جتنی سانسیں لکھوا کر لایا ہے، اُسے اتنی جینی ہیں۔ خود کو سزا دینا مناسب نہیں۔“ خانو حیرت سے میرے اور حکیم صاحب کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ سُن رہا تھا۔ حکیم صاحب جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ”دنیا کی ہر طرب کا تعلق کسی نہ کسی طور انسان کے اعصاب اور اس کی شفا یابی کی خواہش سے ضرور ہوتا ہے۔ جینے کی خواہش اور صحت کی آرزو، بیمار عضو کے خلیوں کے دروازے، دوا کو اندر کشید کرنے کے لیے کھول دیتی ہے، ورنہ سب دوا میں ناکام و نامراد لوٹ جاتی ہیں۔ اپنے جینے کی کوئی وجہ پیدا کیجیے صاحب۔“ حکیم صاحب پلٹ گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ حکمت کا تعلق صرف علاج اور دوا دارو کے علم سے نہیں ہوتا۔ انسان کے اندر جھانک لینا ہی اصل دانش و حکمت ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے کا یہ حکیم بھی کچھ ایسا ہی داناتا تھا، جو صرف انسان کی نبض ہی دیکھنا نہیں جانتا تھا، اُس نبض کی بولی بھی پڑھ سکتا تھا۔

خانو شذوذ سے حکیم صاحب کی ہدایات کے مطابق میری تیمارداری میں جُتا رہا۔ تیسرے دن ڈھول، بتاشوں کے ساتھ ایک جھوم نذر اور نیاز کی دیگیں، سبز چادریں، سنہری غلاف اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ پہنچا۔ عقدہ کھلا کہ زمیں دار صاحب کی خدانے سُن لی ہے اور ان کی گل ناز نے انہیں خوش خبری سنادی ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی ان کے آگلن میں پھول کھلنے والا ہے۔ تھوڑی دیر میں جشن منانے والے یک دم خاموش اور مودب سے کھڑے ہو گئے۔ پتا چلا کہ زمیں دار صاحب خود تشریف لارہے ہیں۔ زمیں دار پگنی عُمر کا ایک سخت گیر اور جہاں دیدہ شخص دکھائی دیتا تھا۔ گل ناز بھی اُس کے ساتھ میرے قدم بوسی کے لیے آئی تھی۔ اس نے دُور ہی

سے اشارہ کر کے اپنے سر کے اشارے سے سائیں کو میری نشان دہی کرا دی۔ زمیں دار مؤدب سامیرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ”میں پہلے اس جھلی کی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا سائیں جی..... بچہ تو مرد کے نصیب سے ہوتا ہے، میں اسے ہمیشہ یہی سمجھاتا رہا، پر یہ ٹھپ ٹھپ کر پیروں فقیروں کے در پر مٹکتیں مانگتی اور چڑھاوے چڑھاتی رہی، مگر اس کے نصیب کا چڑھاوا تو یہیں اسی قصبے کے ریلوے پلیٹ فارم پر انتظار کر رہا تھا۔ آپ بھی ہماری یہ نذر نیاز قبول کرو۔ اور ہاں، آج کے بعد آپ کا تین وقت کا کھانا میری حویلی سے آیا کرے گا۔ خدا کے لیے انکار نہ کرنا۔“ میں نے سر جھکائے، شرمائی سی بیٹھی گل ناز کی طرف دیکھا۔ سارا اسٹیشن دُور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں چپ رہا۔ مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ مزید مشکلات منہ کھولے میری جانب بڑھ رہی ہیں اور میرا رہا سہا چین اور سکون بھی غارت ہونے والا ہے۔ میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مزید اس پلیٹ فارم پر نہ رہنا ان کم زور عقیدہ لوگوں کو زیادہ بھٹکانے کا باعث ہو گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تنہائی بھی کسی کے لیے اتنی بڑی نعمت ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ کم نصیب اس کے لیے ترس ہی جائے۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا، جتنا میں تنہا رہنا چاہتا تھا، میرے گرد ہجوم اُسی قدر بڑھتا جا رہا تھا۔ رات گئے ایک مال گاڑی اسٹیشن پر گئی، تو میں نے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹا۔ پلیٹ فارم پر لگے گھڑیال نے رات کے تین بجنے کا اعلان کیا اور میں دھیرے دھیرے ریٹکتی مال گاڑی میں سوار ہو گیا۔ خانو سمیت سارا پلیٹ فارم چین کی نیند سو رہا تھا۔ میں ایک نسبتاً خالی بوگی میں فرش پر بکھرے خشک ٹھوسے پر نیم دراز ہو گیا۔

اگلی دوپہر کسی نے بوگی کا آہنی دروازہ سر کا یا تو میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی ریلوے اہل کار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دُشت لہجے میں پوچھا۔ ”تم کون ہو، اور یہاں خالی بوگی میں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”فقیر ہوں، نکت کے پیسے نہیں تھے، اس لیے یہاں بیٹھ گیا۔ تم اپنا سامان دیکھ لو، میں نے کچھ نہیں اٹھایا۔“ ریلوے اہل کار کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا بادشاہ! پر آپ کو کہاں جانا ہے۔ یہ مال گاڑی تو اب ہفتہ بھر اسی جکشن پر گلی رہے گی۔ کوئی خدمت ہو ہمارے لائق تو بتاؤ۔“ ”نہیں، تمہاری مہربانی۔ میں یہیں اتر جاتا ہوں۔“ میں چپ چاپ گاڑی سے اتر کر ایک طرف ہو لیا۔ ریلوے اسٹیشن سُنان پڑا تھا۔ شاید یہاں گاڑیوں کا گزر کم ہی ہوتا ہو گا، سہ پہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مجھے ریلوے پلیٹ فارم کا ایک بُرا تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا، لہذا اس بار میں نے پلیٹ فارم پر ڈیرہ جمانے کے بجائے، قصبے سے دُور جاتی ایک پگڈنڈی کی راہ لی۔ سارا راستہ کنکر اور کانٹوں سے اُناڑا تھا اور دُور دُور تک سبزے کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں خشک پڑی تھیں اور راستے بھر دُھول اُڑتی رہی۔ عجیب قحط سالی کی سی کیفیت طاری تھی۔ سارے علاقے میں، میں نے ایک خشک ہوتے جوڑے سے پڑے ڈیرہ جمانے کا فیصلہ کیا، جہاں ایک بوڑھے درخت کی بے تحاشا پھیلی ہوئی شاخوں اور جڑوں نے ایک مسکن بنار کھا تھا۔ شام ہونے سے پہلے میں نے آس پاس کی تھوڑی سی جگہ سے کنکر اور کانٹے ہٹا کر اپنے گزارے کے لیے تھوڑی سی زمین صاف کر لی، لیکن اس ذرا سی مشقت ہی نے مجھے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ میں وہیں درخت سے ٹیک لگا کر سستار ہا تھا کہ دُور سے ایک بوڑھا شخص سائیکل پر کسی بچے کو بٹھائے خرماں خرماں پیڈل مارتا میرے قریب سے گزرا اور پھر آگے جا کر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ دوبارہ میری طرف پلٹا۔ میں نے بے زاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہی آدم زاد.....؟ بوڑھے نے میرے قریب آ کر اچھی طرح میرا جائزہ لیا۔ میں نے چپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔ بوڑھے نے مجھ سے پوچھا ”اس علاقے میں نئے آئے لگتے ہو جی..... میرا نام مہر دین ہے، اور یہ میرا پوتا ہے کمالا۔ کوئی روٹی نکر چاہیے ہو تو بتاؤ جی۔ میں اس علاقے کا ڈاکٹر ہوں۔“ میں نے دُور کھڑی سُرخی سائیکل کے پیسے سے کھیتے بچے پر نظر ڈالی۔ ”نہیں میرے پاس جھولے میں کچھ چنے اور گڑ موجود ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ یہاں سے۔“ بوڑھے مہر دین پر میری کُرختگی کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ وہ آس پاس میلوں دُور تک پھیلی بھرو بے آب زمین کو دیکھتے ہوئے حسرت سے بولا۔ ”صاف پانی کا بڑا کال ہے یہاں۔ انسان اور جناور، بندے اور ڈنگر سارے اسی جوڑے سے پانی پیتے ہیں۔ برسوں سے بارش کا ایک چھینٹا بھی نہیں برسا یہاں پر۔ میں کوشش کروں گا کہ کہیں سے ایک صراحی صاف پانی لادوں تمہیں۔“ بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چل کمالے! تیری ماں راہ دیکھتی ہو گی۔“ مہر دین اپنی سائیکل کی طرف جاتے جاتے دوپل کے لیے رُکا۔ ”جو گی اور سائیں لوگوں کی دُعا میں بڑا اثر ہوتا ہے، ہمارے علاقے کے لیے بھی دوپل پڑھ دینا، جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ۔“ میں خاموش رہا۔ مہر دین نے ایک لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے ٹکون کی سانس لی اور آنکھیں موند لیں، مگر ٹکون بھلا کب لکھا تھا، لکھنے والے نے میری قسمت میں۔

اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ زور کا مینہ برسا کہ ہر طرف جل جھل ہو گیا۔ اچانک ایک جانب سے شور مچا اٹھا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو مہر دین ایک ہجوم کی قیادت کرتا، میری جانب دوڑا چلا آ رہا تھا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے ان گنت بد صورت رفقاء، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل: sundaymagazine@janggroup.com.pk

خلیل جبران نے کہا تھا ”جب کبھی میں نے صبر کی زمین میں اپنے درد کا پودا سیٹھا بدلے میں اس نے مجھے خوشی کا پھل دیا“ مگر شاید میرے نصیب میں صرف درد، غم اور پریشانی کے تناور درخت ہی لکھے تھے۔ مہر دین اور اس شور مچاتے ہجوم کی صورت میں ایک نئی مصیبت میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی۔ بارش کی بو چھاڑ تیز تر اور ان سب کے نعروں کا شور ہنگامہ خیز تھا۔ پاؤں میں پڑنے چنل اور سروں پر ناکافی اور چھید بھری برائے نام چھتیاں، وہ سب میرے قریب پہنچے تو میرے پھرے ہوئے تیور دیکھ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ کچھ لمحوں تک ہمارے درمیان صرف برستی بوندوں کی بولی مترنم کے فرائض سرانجام دیتی رہی، مگر دنیا کا سب سے مشکل کام شاید خاموش رہنا ہے۔ سو ان سب کو بھی یہ خاموشی گھٹنے لگی اور پھر مہر دین ہی نے سب سے پہلے ہمت کی اور ہلکے سے کھنکار کر بولا ”یہ سب یہاں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں سائیں لو کو..... میں تو کل ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اپنے اس بنجر اور خشک علاقے کی قسمت بھی گھٹنے والی ہے، مگر تم نے تو ایک رات ہی میں کرشمہ کر دکھایا۔“ میں نے درشت لہجے میں ان سب کو دھتکارا۔ ”یہ بوڑھا مہر دین دیوانہ ہو گیا ہے شاید..... اور تم سب بھی بڑے بدحوہ ہو“ جو اس کی باتوں میں آ کر یہاں چلے آئے ہو.....؟ بارشیں اپنے وقت ہی پر برستی ہیں، چاہے آسمان کے بادلوں کی ہوں یا پھر نصیب کی، جاؤ جا کر پانی ذخیرہ کرنے کی کوئی تدبیر کرو، ورنہ پھر سالوں تک پانی کو ترستے رہو گے۔“ پتا نہیں، انہیں میری بات کتنی سمجھ آئی اور کتنی رائیگاں گئی، مگر ان میں سے کچھ بزرگ اور کچھ ٹٹیر کے چند لوگ آگے بڑھے، کسی نے چادر، کسی نے چاول، گڑ اور پنچوں سے بھرے جھولے میرے سامنے خالی کر دیے، کوئی جیب میں چند سٹکے بھر کر لایا تھا، تو کسی نے دودھ سے بھری گڈوی میرے سامنے دھر دی۔ مہر دین رو پڑا۔ ”ہمارے پاس بس یہی کچھ ہے سائیں لو کو! اسے قبول کر لو اور وعدہ کرو، اب تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہمیشہ ہمارا سایہ بن کر بیٹیں ڈیرہ ڈالے رہو گے۔“ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ان لوگوں کو مزید سمجھانا بے فائدہ تھا، اس لمحے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس برستی بارش سے لڑ پڑوں، انسان اپنے ظاہری دشمن سے جنگ لڑ سکتا ہے، اُسے ہرا کر شکست دے سکتا ہے۔ اپنی ”فتح“ جیت سکتا ہے، مگر مقدر سے نہیں لڑ سکتا۔ سو، مقدر کے ہاتھوں زخمی ہو کر میں وہیں درخت کے نیچے بیٹھا بھیگتا رہا، پر..... کچھ بارشیں صرف بنجر دھرتی کو سیراب کرنے کے لیے ہی برستی ہیں، جو دل کے سنگتے آنگن کو بھگودے، ایسا ساون میری قسمت میں بھلا کب تھا؟ اگلے روز مہر دین میرے پاس آیا، تو میں نے سختی سے اسے منع کیا کہ اگر اس کی بستی والوں نے مجھے زیادہ تنگ کیا یا اس پاس کے علاقوں میں اس اتفاقہ بارش کا خوا خواہ چرچا کیا، تو میں چپ چاپ یہاں سے اٹھ کر کسی اور جانب نکل جاؤں گا۔ مہر دین نے فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور قسم کھائی کہ وہ ایسا ”گناہ“ کرے گا نہ کسی اور کو کرنے دے گا۔

میرے پاس اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا؟ کسی نئی بستی یا جنگل کی جانب نکلنے سے پہلے کچھ دن یہاں پانا اب ناگزیر لگنے لگا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس بار یہ جوگی سائیں کا لقب اور ان بھولے بھالے لوگوں کی یہ ضعیف الاعتقادی کا بت ہمیشہ کے لیے توڑ کر ہی آگے بڑھوں گا۔ مہر دین نے میری دھمکی شاید بہت مؤثر انداز میں بستی کے لوگوں تک پہنچادی تھی، اسی لیے چند دن سکون رہا۔ البتہ عصر کے بعد مغرب تک کے وقفے میں اگاؤ کا ضرورت مند مجھ سے کچھ فاصلے پر دُور پگڈنڈی پر آ بیٹھے اور دُور ہی سے دُعا کی التجا کر کے واپس پلٹ جاتے۔ انسان اور دُعا کا بھی کتنا پُرانا، کیسا ازلی، ابدی رشتہ ہے۔ جانے کائنات میں دُعا پہلے وارد ہوئی ہو گی یا انسان؟ میں دن بھر خود کو یہاں وہاں الجھائے رکھنے کی کوشش میں کسی نہ کسی طور صبح سے شام تو کر لیتا تھا، مگر شام ڈھلتے ہی اس کی یادیں کالی رات کے سایوں کی طرح مجھے گھیر لیتیں۔ جانے وہ کیسی ہو گی۔ واپس آ کر اس نے دوبارہ اپنا ریڈیو پروگرام شروع کیا ہو گا کہ نہیں؟ اب وہ کیسی دھکتی ہو گی؟ کچھ چہروں کا حسن صرف ضرب کھانا جانتا ہے، کبھی تقسیم نہیں ہوتا۔ وہ بھی دگنی چو گنی دل کش اور حسین ہو چکی ہو گی۔ کاش! دنیا کے کسی جراح کے پاس تو وہ نشتر ہوتا، جو ایک ہی چر کے میں ہمارے سارے جسم سے ان یادوں کا سارا ہر ٹکال پھینکتا۔

اگلے روز مہر دین کے ساتھ ایک دوسرا بوڑھا بھی کھنکارتے ہوئے، عصر کے بعد میرے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔ ”یہ شکور دین ہے سائیں لو کو..... اپنا شکور..... اس کی نوا سی کو بڑے زور کا بخار ہو گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دو تو دُعا کے لیے اسے یہاں لے آئیں۔“ میں نے ناگواری سے مہر دین کی طرف دیکھا۔ اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ ”میں نے اسے بہت سمجھایا ہے سائیں، پر یہ جھٹلا میری بات سمجھتا ہی نہیں، کہتا ہے سائیں سے روبرو دُعا کی درخواست کر دیکھو۔ بڑا مجبور ہے بے چارہ۔ اس کی سکینہ کو جن آتے ہیں جناب۔ دُور کی دُعا سے وہ شیطان بھلا کہاں جان چھوڑیں گے اس کی۔“ میں نے جان ٹھنڈانے کے لیے کہہ دیا کہ میں دُعا کر دوں گا، اگر تین دن تک لڑکی کی طبیعت نہ سنبھلے، تو اسے لے آنا۔ ان دُور دراز کے علاقوں میں جو ان لڑکیوں کو مختلف گھریلو اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے ہسٹریا کے یاد گیر نفسیاتی دورے پڑتے رہتے ہیں، جن کا دورانیہ چند گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شکورے کی نوا سی بھی ایک آدھ دن میں بھلی چنگی ہو جائے گی، مگر ہمیشہ کی طرح میری یہ خوش فہمی بھی تیسرے دن ہی دور ہو گئی۔ جب شکور اسیاہ چادر میں لپٹی گم صُم سی ایک لڑکی کو لے کر میرے ٹھکانے پر آ پہنچا۔ میں خود اپنے ہی الفاظ کے جال میں پھنس چکا تھا۔

سو، بادلِ خواستہ دکھاوے کے طور پر دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ گلابی شام کے ڈھلتے سورج کی کرن سے سکینہ کے ناک کا لونگ پل بھر کے لیے چکا تو ایک لمحے کے لیے میری نظر اس کی نظر سے ٹکرائی۔ اُف..... کس قدر ویران آنکھیں تھیں۔ کسی برباد شہر کی طرح جس کا سب کچھ لوٹ کر، جاتے ہوئے لٹیرے تیل چھڑک کر آگ بھی لگا گئے ہوں۔ کچھ ایسا ہی دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا مجھے سکینہ کی ان جلتی آنکھوں سے۔ شکور اپنی دُھن میں بولے جارہا تھا ”کچھ عرصہ پہلے تک بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ ہنسی بولتی تھی ’ساری سکیوں سمیت پورے گاؤں میں اودھم مچاتی پھرتی تھی۔ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا، ان کی شیطانوں سے، بانگوں میں مجھو لے مجھو لتی تھیں‘ ایک گھر کی چھت سے دوسری چھت تک کد کڑے لگاتی پھرتی تھی یہ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ رفتہ رفتہ اسے چپ لگتی گئی ’ساری ہنسی اور قہقہے کھو گئے اور یہ ایسی ہو گئی۔ اس کی نانی کہتی ہے کہ وہ اسی لیے ان گڑیوں کو شام ڈھلنے کے بعد ویران جگہوں پر جانے سے منع کرتی تھی۔ ضرور کسی ویران درخت تلے بیٹھے بیٹھے اسے کوئی جن چٹ گیا ہے۔ بس سائیں جی‘ اب تمہاری دُعا ہی کا آسرا ہے‘ کچھ ایسا پڑھ کر پھو نکو کہ میری سکینہ پھر سے پہلے جیسی ہو جائے۔“ اس تمام عرصے میں، سکینہ ہم دونوں سے لاتعلقی سی بیٹھی، کچی زمین پر ایک تنکے کی مدد سے لکیریں بناتی اور مٹاتی رہی ’ڈھلتی شام میں، اس کے چہرے کی پیلاہٹ نے آس پاس کے ماحول میں سرسوں سی بکھیر رکھی تھی۔ میں نے بنا کچھ کہے چپ چاپ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میری دیکھا دیکھی پہلے شکور نے اور پھر سکینہ نے بھی اس کی تقلید میں ہاتھ اٹھا دیئے۔ خود اپنے لیے دعا مانگتی مجھے وہ بہت معصوم لگی۔ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر شکور سے کہا ”اسے کسی اچھے حکیم یا طبیب کو دکھاؤ، ہو سکے تو شہر لے جا کر کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ، دُعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے۔“ شکور نے آہ بھری ”آپ ٹھیک کہتے ہو سائیں جی، پر یہ پگلی کسی کی سنتی کب ہے‘ میں نے شہر چلنے کا کہا تو صاف انکار کر دیا اس نے، کہتی ہے، اس کا جو ہونا ہے، ادھر ہی ہونا ہے۔“ میں نے غور سے سکینہ کی طرف دیکھا ”کیوں لڑ کی! کیوں تنگ کرتی ہو اپنے بزرگوں کو۔ بات کیوں نہیں مان لیتی ان کی.....؟“ سکینہ میری ڈانٹ سے گھبرا سی گئی ”جی..... وہ.....“ مجھے لگا کہ اپنے نانا کی وجہ سے وہ کھل کر بات نہیں کر پار ہی تھی ’سُر جھکا کر بس اتنا ہی بول پائی“ ٹھیک ہے جی..... آپ کہتے ہو تو مان لوں گی۔“ شکور اخوش ہو گیا ”دیکھا سائیں! میں جانتا تھا اس کا علاج تمہارے پاس ہی ملے گا۔“ شکور اسکینہ کو ساتھ لیے واپس پلٹ گیا، مگر نہ جانے کیوں ان دونوں کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک مجھے سکینہ کی ویران خالی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اپنے آس پاس ہی بھٹکتی ہوئی محسوس ہوتی رہیں۔ سورج کی زردی شب کی سیاہی میں تبدیل ہوئی تو رات کا چاند سکینہ کے چہرے کا سورج منگھی لیے آسمان پر دوبارہ نمودار ہو گیا۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ اُس کی آنکھوں میں زمانے بھر کا وہ کرب، کیسا تھا؟

اگلی صبح مہر دین تازہ پانی کی صراحی لایا تو اس نے خود ہی شکور سے کا ذکر ’چھپر دیا“ کل سے ذرا سکون ہے‘ نیناؤں کے گھر میں‘ کیسی ہنسی بولتی چڑیا سی تھی بے چاری سکینہ‘ اب تو جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے اس کے۔“ میں نے مہر دین کی طرف دیکھا۔ ”اچانک ایسا کیا ہو گیا اسے..... اور اس کی یہ حالت کب سے ہے؟“ ”تین سال ہو گئے ہیں سرکار، بہت علاج کر دیا‘ بڑے پھیرے لگائے ہیں شکور نے

آس پاس کی ساری بستیوں کے‘ کوئی مزار کوئی درگاہ نہیں چھوڑی‘ جہاں اس نے دُعا نہ کی ہو، علاقے کے سارے وید‘ حکیم اور طبیب بھی تھک کر ہمت ہار چکے ہیں۔ کسی نے شکور سے کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے لڑکی کو لے کر کسی دُور دراز کی بستی چلا جائے، شاید ماحول بدلنے سے کچھ بہتری ہو‘ مگر یہ طریقہ بھی بے فائدہ رہا۔ آخر کار‘ شکور نے کو واپس لوٹنا ہی پڑا۔ ابھی چند دن پہلے، جس رات تمہاری دُعا سے علاقے میں بارش برسی تھی‘ اس سے ایک رات پہلے ہی تو شکور واپس لوٹا تھا اپنی سکینہ کو لے کر۔“ میں نے بے خیالی میں مہر دین سے پوچھا ”کہاں لے گیا تھا شکور دین اپنی نواسی کو؟“ ”شکر گڑھ، وہیں ریلوے پلیٹ فارم کے قریب ہی گھر ہے اس کے داماد کا۔“ میں چونک سا گیا‘ یہ تو وہی علاقہ تھا‘ جس کے پلیٹ فارم پر خانو کا کیمین واقع تھا۔ ”کتنا عرصہ رہی وہاں سکینہ؟“ ”لگ بھگ چھ ماہ، مگر وہاں بھی اس جھلی کا مَن نہیں لگا۔ بس دن بھر بیٹھی آسمان کو بھتی رہتی تھی۔“ پھر کچھ سوچ کر مہر دین خود ہی اُداس ہو گیا ”اور پتا ہے سائیں جی! کبھی کبھی تو بالکل جو گنوں جیسی حرکتیں کرتی ہے، اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔“ مہر دین کی باتیں سن کر میرے اندر کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ میں نے مہر دین سے کہا کہ وہ شام ڈھلنے سے پہلے شکور سے کو میرے پاس بھیج دے۔ سر شام ہی شکور سکینہ سمیت آ گیا۔ ”حکم سائیں۔“ ”سکینہ کیسی ہے اب؟“ شکور دین نے گہرا سانس لیا ”پہلے سے کچھ بہتر ہے سائیں! ایک آدھ دن میں شہر کی بڑی ڈاکٹرنی کو بھی دکھانے لے جاؤں گا۔ سکینہ کے باپ کو بھیجا ہے میں نے شہر‘ ڈاکٹرنی کا پتا لگانے اور وقت لینے کے لیے۔“ میں نے اپنے اندر ابھرتے ایک عجیب سے موہوم خدشے کی تصدیق چاہی۔ ”جب تم سکینہ کو دوسری بستی لے گئے تھے، ماحول بدلنے کے لیے‘ تب وہاں اس کا میل جول کن لوگوں کے ساتھ تھا؟“ شکور نے نے تاسف بھرے لہجے میں سکینہ کی حالتِ زار بیان کی ”وہ کب کسی سے ملتی ہے سائیں جی! وہاں بھی سارا دن گم صُم بیٹھی رہتی تھی۔“ سکینہ اس وقت بھی ہم دونوں کی باتوں سے لاتعلقی سے بیٹھی زمین پر تنکے کی مدد سے اپنا پسندیدہ کھیل کھیل رہی تھی۔ اتنے میں گاؤں سے ایک بچی عمر کا جوڑا آ کر ہم سے کچھ دور فاصلے پر بیٹھ گیا۔ عورت کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔ مرد نے منت کی ”سائیں جی! ہمارا چھوٹا بیٹا بہت بیمار ہے۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ دُعا کرو کہ ٹھیک ہو جائے۔ بڑا تیز بخار ہے اسے تین دن سے۔“ میرا جی چاہا کہ میں انہیں بڑی طرح دھتکار دوں۔ میں نے مرد کو جھاڑا کہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے یہاں کیوں آ گیا ہے؟ مرد نے بتایا کہ وہ کافی علاج کروا چکا ہے، مگر بچے کی حالت نہیں سدھ رہی۔ تنکے کی مدد سے زمین پر لکیریں کھینچتی سکینہ نے دھیرے سے خود کلامی کی ”ٹھیک ہو جائے گا صبح تک رب کی مرضی سے، بس آج کی رات کی سختی ہے۔“ شکور گاؤں سے آئے ہوئے جوڑے سے بات چیت میں مصروف تھا، اس لیے میرے علاوہ کسی نے بھی سکینہ کی یہ

سرگوشی نہیں سنی۔ ویسے بھی اس کی آواز اتنی دھیمی تھی، جیسے وہ خود اپنے آپ سے بڑبڑا رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ عورت اور مرد دعا لیے بنا وہاں سے نہیں ٹلیں گے، لہذا حسب معمول میں نے اپنے سدا کے خالی ہاتھوں کا کھٹکول ہوا میں بلند کر لیا۔ اس جوڑے کے جانے کے بعد شکور اور سکینہ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ شکور نے جاتے جاتے بتایا کہ اگر شہر میں بات بن گئی تو وہ سکینہ کو کل ہی شہر لے جائے گا۔ میرے اندر کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی، جیسے کوئی بہت بڑا سربستہ راز اپنے قفل کھولنے کو بے تاب ہو، مگر میں اپنی کم علمی اور جہالت کی وجہ سے اس کی کنجی کہیں کھو بیٹھا ہوں۔

اگلی صبح سورج کچھ زیادہ ہی ناراض سا نمودار ہوا اور اپنا غصہ، جھلکتی کرنوں کی صورت، بن سایہ جان داروں پر برسائے لگا۔ دوپہر سے پہلے ہی گزشتہ روز والا مرد بھاگتا ہوا آیا اور میرے قدموں میں گر گیا ”میرے کا کے کا بخار اتر گیا ہے سائیں جی، کل رات تو ہم سمجھے تھے کہ بس جان لے کر ہی چھوڑے گا یہ بخار اس کی۔ بڑا ترپا ہے ساری رات بستر پر، جیسے کوئی مچھلی بن پانی کے تڑپتی ہے۔ سچ بتاؤں سائیں، میں تو امید چھوڑ بیٹھا تھا، مگر پھر تمہاری دعا نے فجر کے بعد ایسا اثر دکھایا کہ سورج نکلنے تک میرا بچہ بھلا چنگا ہو کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب تمہاری کرامت ہے سائیں۔ سارے تمہاری دعا کے کرشمے اور برکتیں ہیں۔ قربان جاؤں میں اپنے سوہنڑے رب کے، اُس نے تمہیں ہم غریبوں کی مدد کے لیے بھیجا ہے، اس بستی میں“۔ وجوش میں نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، مگر میرے تو سارے الفاظ ہی جانے کہاں کھو گئے تھے۔ کل ہی میرے سامنے سکینہ نے یہ سرگوشی کی تھی کہ شکور نے کا پچھڑا رات بھر کی سختی کے بعد صبح شفایات ہو جائے گا اور اس کی کہی ہوئی بات ہو، ہو ٹھیک ہوئی تھی، یہ سب کیا ماجرا تھا؟ اور پھر میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے جھماکے ہوتے گئے، سکینہ بھی اُسی دن واپس اپنی بستی پہنچی تھی، جس دن میں نے یہاں ڈیرہ ڈالا تھا اور پھر اُسی رات اس علاقے میں برسوں بعد بارش برسی تھی۔ دوسرا جھماکا ہوا، اور مجھے مہر دین کی بات یاد آئی کہ سکینہ کا نانا سکینہ کو ماحول کی تبدیلی کے لیے اسی قصبے میں لے گیا تھا، جہاں ریلوے پلیٹ فارم پر میرا ٹھکانہ تھا۔ میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر ٹھٹھلے لگا۔ جہاں جہاں قدرت نے میری دعا کی لاج رکھی تھی، وہاں آس پاس سکینہ کی موجودگی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت سکینہ کے گھر چلا جاؤں، مگر لوگ میری اس حرکت کا نہ جانے کیا مطلب لیتے، میں دو چار قدم بڑھ کر واپس پلٹ آیا۔ اتنے میں دور پگھلنڈی پر سورج کی قہر برساتی دھوپ کی گرمی سے قیمتی زمین سے اٹھتی سراب کی لہروں میں مجھے شکور کے کا ہیولا دھیرے دھیرے لائٹھی ٹیکتا، شہر کی جانب جاتی بڑی سڑک کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے سرٹھکائے گٹھری سی بنی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ضرور وہ سکینہ ہی ہو گی۔ ایسے موقعوں پر انسان کے دل اور زبان سے ہمیشہ کچھ اس قسم کے غیر تشکرانہ فقرے ادا ہوتے ہیں کہ ”کاش! میں اس وقت کچھ اور مانگ لیتا، تو خدا وہ بھی ضرور دے دیتا“ مگر ہم انسان بھی کتنے بھولے ہیں۔ بھلا اس لمحے کسی کو کچھ اور مانگنے کا خیال ہی کب آتا ہے۔ ہمیں ٹھیک قبولیت کے لمحے قدرت جو عطا کرتی ہے، ہم اسی پر شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟ مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ مجھے اس لمحے شکور اور سکینہ ہی اپنی ہر چاہت، ہر دعا کا بدل نظر آ رہے تھے۔ شکور میرے قریب پہنچا تو گرمی کی وجہ سے بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ ”شہر کی بڑی ڈاکٹرنی سے بات ہو گئی ہے سائیں جی..... اس نیماڑی کو وہیں لے جا رہا ہوں۔ اس کے باپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہارا حکم نہ ہوتا تو کبھی نہ جاتا۔ دعا کرنا ہمارے لیے۔ اگر بس وقت پر مل گئی تو رات تک واپسی ہو گی، ورنہ کل تیری خدمت میں حاضری دوں گا۔“

سکینہ حسب معمول سرٹھکائے کھڑی تھی۔ میں نے شکور کے کو دو لمحے درخت کے نیچے سستانے کا اشارہ کیا۔ سکینہ نے خود کو سمیٹا اور اپنے کم زور اور مضطرب وجود کو شکور کے پیچھے پھپھالیا۔ شکور نے سوائی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی ”کچھ دیر سستالو، شاید شہر جانے کی ضرورت نہ رہے اب، تم شکر گڑھ کے اسٹیشن پر کھو کھا لگانے والے خانو کو جانتے ہو؟“ شکور نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”ہاں جی..... وہ میرے داماد کا مسایہ ہے۔ وہیں ریلوے اسٹیشن کے باہر ہی تو کوارٹر ہے میری بیابتا بیٹی کا۔“ ”اور اس علاقے کا چوہدری.....؟“ کبھی اس سے ملاقات ہوئی ہے تمہاری یا سکینہ کی؟“ ”نہیں جی، براہ راست تو ملاقات نہیں ہوئی، ہاں ایک آدھ بار میں جب سکینہ کو لے کر ریاست پور کی بڑی درگاہ پر دعا کے لیے گیا تھا تب وہاں چوہدری صاحب بھی اپنی گھر والی کے ساتھ دعا کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہیں دعا کرتے دیکھا تھا انہیں۔“ اب میرے پاس مزید شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ میں نے شکور کے کوا ایک جانب ہٹنے کا اشارہ کیا اور براہ راست سکینہ کی طرف دیکھا، وہ میری نظروں کی کاٹ سے گھبرا کر مزید سٹ گئی، میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی ”کون ہو تم.....؟“

(جاری ہے)



.....باشم ندیم.....

باشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رفقوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہاتھ ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میرا سوال عُن کر سکینہ سے زیادہ شکورے کے چہرے پر حیرت اور تعجب کی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ سکینہ نے گھبرا کر اپنے نانا کی طرف دیکھا، جیسے اس سے اپنی شناخت کی تصدیق چاہتی ہو۔ شکورے نے گڑبڑا کر کچھ کہنے کی کوشش کی ”سائیں یہ میری نواسی.....“ میں نے ہاتھ اٹھا کر شکورے کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”سکینہ کو جواب دینے دو“ سکینہ مزید بول کھلا گئی ”وہ جی..... میں..... میں تو بس سکینہ ہوں۔“ ”نہیں، تم وہ نہیں جو“ نظر آتی ہو۔ ساری دنیا کو دعائیں دیتی پھرتی ہو۔ ان کے لیے رب سے مانگتی ہو، پھر خود کو اس جو گن کے بھیس میں کیوں ڈھال رکھا ہے؟ کیوں فقیر بنی بنی پھرتی ہو؟ کیوں خود کو اور اپنے گھر والوں کو اس عذاب میں ڈال رکھا ہے؟ بولو، بولتی کیوں نہیں.....؟“ شکورامیرے غصے بھرے لہجے کو میرا جلال سمجھ کر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ سکینہ بالکل روہانسی ہو گئی اور اس نے خود کو شکورے کی اوٹ میں پھنچالیا، پھر مجھے احساس ہوا کہ شاید غصے میں میرا لہجہ کچھ زیادہ ہی تلخ اور بلند ہو گیا تھا۔ یہ لڑکیاں جانے کس ریشم کی بنی ہوتی ہیں، لہجوں کی تیز دھار سے بھی کٹ کٹ جاتی ہیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور شکورے سے کہا کہ فی الحال وہ واپس اپنے گھر چلا جائے، جب ضرورت ہوئی تو میں خود اسے بلا لوں گا۔ شکورے کا دل وہاں سے اٹھ کر جانے کو نہیں تھا، مگر میرے لہجے کی سختی نے اسے بادل نخواستہ اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سکینہ بھی چپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔ اس کی گھبراہٹ اور آنکھوں میں اُٹھتے سوالوں سے ایک بات تو مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ خود اسے بھی اپنی ان دعاؤں کی قبولیت کی کرامت کا کوئی علم نہیں۔ ساری بات مجھ پر دھیرے دھیرے گھلنے لگی تھی، جانے یہ اتفاق تھا یا میری تقدیر کا ایک اور مذاق، مگر سچ یہی تھا کہ خانو والے پلیٹ فارم سے جہاں میرے ماتھے پر جوگی سائیں کی مہر لگی تھی، ہر اس جگہ کے آس پاس سکینہ موجود رہی تھی، جہاں لوگ میری دعا کی قبولیت کے لیے بھٹکتے رہے تھے اور آج تک ان سب جگہوں پر خانو سمیت جس ضرورت مند کی دعا بھی قبول ہوئی، دراصل وہ سکینہ کی دعا کی بدولت ہی ممکن ہو سکا تھا۔ قدرت یہ سب میرے کھاتے میں ڈالتی رہی اور سیدھے سادے لوگ میرے مرید بنتے چلے گئے۔ کسی کو بھی یہ پتا نہیں چلا کہ ان کی یہ دعائیں ایک نڈھال اور لاغری لڑکی کی سفارش کے بدلے قبولیت کا رنگ لاتی ہیں۔ اگلے ایک دو روز میں، میں نے باتوں باتوں میں شکورے سے ان سب باتوں کی تصدیق بھی کر لی۔ خانو کی بیوی اپنے ہمسایوں کے سامنے ہر لمحہ خانو کی غربی اور اپنی معاشی مشکلات کا رونا روتی رہتی تھی اور خانو کا بانڈ گھلنے سے پہلے بھی وہ کئی بار سکینہ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ اگر خانو کا بانڈ گھل جائے، تو ان کے دن پھر جائیں گے، ٹھیک اسی طرح سارے گاؤں کو پتا تھا کہ چوہدرانی کو اولاد کی خواہش ہے، جیسے اس علاقے کے لوگ بارش کی تمنا میں نڈھال تھے، مگر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوا، کتنا پریشان کیا تھا مجھے اس جوگی سائیں کے لقب نے، لوگوں کو سکینہ کی اصلیت کا پتا کیوں نہیں چلا؟ لوگ تو درکنار، خود سکینہ بھی اپنے آپ سے ناواقف نظر آتی تھی، ہمارے معاشرے میں لوگ ہمیشہ سائیں، بابوں اور جوگیوں ہی کو اپنا آخری مسیحا کیوں سمجھتے ہیں، کوئی سائینڈ، جو گن یا بی بی ان کی نظر میں دُکھوں کی مسیحا کیوں ثابت نہیں ہوتی؟ سچ کہتے ہیں یہ دنیا مردنے اپنی جاگیر سمجھ رکھی ہے۔ کوئی رتبہ، کوئی عہدہ، کوئی نشست بھی تو خالی نہیں چھوڑی، اس نے حوا کی بیٹی کے لیے، مگر ایک سوال خود میرے اندر بھی کسی سنبولیے کی طرح کلہا رہا تھا۔ سکینہ کو یہ اعزاز کب اور کیسے حاصل ہوا۔ کون سی ریاضت ایسی تھی، جو اسے اس مقام پر لے آئی تھی۔

اگلی شام علاقے سے خانہ بدوشوں کی ایک ٹولی کا گزر ہوا۔ انہوں نے میرے ڈیرے سے کچھ پڑے اپنے خیمے گاڑ لیے اور شب ب سری کے لیے آگ کا لاد روشن کر لیا۔ ان کے دو بڑے میرے پاس اجازت لینے آئے کہ اگر مجھے ناگوار خاطر نہ ہو تو ان کا معمول رات دیر گئے تک صوفیانہ کلام اور کافیاں گانے کا ہے، میں اب انہیں کیا بتاتا کہ کبھی میرے گھر اور گاڑی میں ہر لمحہ یہ کلام بجا کرتا تھا۔ موسیقی کا ہماری زندگی سے کچھ عجیب سا رشتہ ہے۔ ہم کبھی اسے مذہب کی وجہ سے رد کرتے ہیں اور کبھی دل کی خاطر اپنا لیتے ہیں۔ حرام اور حلال کی تقسیم میں دنیا کے بڑے بڑے گویے اس اُت سے جان ٹھوڑانے کے بعد بھی کسی نہ کسی حیثیت میں اس سے دوبارہ جڑ جاتے ہیں۔ کچھ خود کو نعتیہ اور حمدیہ کلام تک محدود کر لیتے ہیں، کچھ صرف صوفیانہ کلام کی لے پکڑ لیتے ہیں، گویا جھگڑا سُر سے نہیں سنگیت سے ہے، لے کا نہیں، صرف تال کا ہے۔ میں جب دینی میں تھا، تو میں نے بہت خوب صورت اور سُریلی اذان سُنی تھی۔ یہی حال میرا اپنن کی مسجد کے ایک مؤذن کی خوش الحانی عُن کر بھی ہوا تھا۔ ایسی آواز کہ قدم جکڑ کر رکھ دے۔ انسان خود بہ خود دعوت دینے والے کی جانب بڑھ جائے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت دینی کے ایک رمضان کی تراویح میں سورہ رحمان کی تلاوت عُن کر ہوئی تھی میری، شاید کچھ خوش الحانیوں کا تعلق ہماری روح کے کچھ دھاگوں، خیر کے کچھ ریشوں سے بھی جڑا ہوتا ہے، خانہ بدوش قبیلے کا وہ خوش الحان بھی بہت سُریلا تھا۔ بابا بیسے شاہ کا کلام گڈوی کی تھاپ پر رات کی خاموشی میں سُر بکھیر رہا تھا۔

جا دَس دے دلبر مای نون
میگوں یار بھلایا جاندا نہیں
سر رکھ کے یار دے قدماں وچ
عُر فیر اٹھایا جاندا نہیں
میرا دل اک اے، میری جان اک اے
میرا دین اک، میرا ایمان اک اے
جدوں رب رسول قرآن اک اے
دو جا یار بنایا جاندا نہیں

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ گھائل روح ہمیشہ جانتی ہے کہ اس کے رستے زخموں کا مرہم کیا ہے، مسئلہ صرف دماغ کو منانے کا ہے

کہ دل اور دماغ کی یہ ازلی جنگ ہم مجبور، کم زور اور بے بس انسانوں کو سدا و حضوں میں تقسیم رکھتی ہے، ہم دین کے ہو پاتے ہیں نہ دنیا کے، مجھ جیسے پری زاد بن جاتے ہیں، میں اک بنجارہ، جس کے لیے نہ کبھی زمین مہرباں رہی نہ آسمان۔ جانے کیا سوچ کر میری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے، تب ہی میرے قریب سے ایک ملائم سی آواز ابھری ”آپ رو رہے ہو سائیں جی.....؟؟“ میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں، سکینہ جانے کب سے میرے قریب کچھ قدم کے فاصلے پر آ بیٹھی تھی۔ میں نے حیرت سے اس پاس نظر ڈالی، بستی کے بہت سے گھرانے خانہ بدوشوں کے جگ راتے میں شریک ہونے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ کچھ فاصلے پر مہر دین، اور شکور ابھی بیٹھے سر دھنتے نظر آئے۔ ”ہاں..... کچھ یاد کر کے آنکھ بھر آئی۔ تمہاری آنکھیں بھی تو ہر لمحہ چھلکنے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔ کیا غم ہے تمہیں؟ اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے بتا سکتی ہو۔“ سکینہ سر ٹھک کائے بیٹھی رہی، شکور نے اٹھ کر میری طرف آنے کی کوشش کی، تو مہر دین نے اسے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھادیا اور جانے اس کے کان میں کیا کہا۔ شاید مہر دین بھی سمجھ گیا تھا کہ سکینہ کبھی اپنے نانا کے سامنے ٹھل کر زبان نہیں کھولے گی۔ سکینہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا ”کچھ نہیں ہوا ہے مجھے سائیں جی۔ میرے گھر والے تو بس ایسے ہی ہلکان ہو رہے ہیں۔ خود ہی رُل ٹھل کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مجھے بھلا کیا ہونا ہے.....؟؟“ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا ”پھر ایک دم دنیا کیوں تیاگ دی تم نے، جو گن کیوں بن گئی ہو.....؟؟“ سکینہ نے پل بھر کے لیے نظریں اٹھائیں ”جوگ تو آپ نے بھی لے رکھا ہے سائیں جی..... آپ نے بھی کوئی روگ لگا رکھا ہے کیا.....؟؟“ میں نے چونک کر سکینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک سوال ہی میں، میرے سارے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ میں بھی کتنا کم فہم اور نادان تھا۔ اتنے سامنے کی بات سمجھنے میں مجھے اتنی دیر لگ گئی تھی، دنیا کے ہر جوگ کے پیچھے یہی اک محبت کا روگ ہی تو چھپا ہوتا ہے، یہی عشق کا فرما رہتا ہے، ہر عذاب کے درپردہ، اسی پیار کے نشتر کی کاٹ کا داغ ملتا ہے، ہر زخم کے پس منظر میں۔ محبت ہمیں سائیں بنا دیتی ہے، جوگی کے روپ میں ڈھال دیتی ہے، فقیر کے بہروپ میں لا کھڑا کرتی ہے۔ سکینہ کی کہانی بھی اسی محبت کے مارے بد نصیبوں میں سے ایک کی داستان تھی۔ تین سال پہلے جب وہ مکمل زندہ لڑکی تھی، جس کا دل بارش کی پہلی بوند کے ساتھ ہی جھولا ڈالنے کے لیے پھٹنے لگتا تھا، ہوا کی سرگوشیاں جس کے دل کو گد گداتی تھیں، لمحہ بھر کے لیے ٹھہرے بادل کا سایہ، جسے دن بھر کے لیے خوش کر دیتا تھا۔ تب ایسی ہی ایک کالی رات، جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ برف بھری ٹو کریوں میں باغ سے آم چڑا کر جمع کر رہی تھی، تب ہی اُسے علاقے کے ایک گبرو، سانول نے دیکھ لیا۔ سانول علاقے کے نمبردار کا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا بیٹا تھا، جو شہر کی یونیورسٹی سے ایم اے لسانیات کی ڈگری لے کر آیا تھا اور اس ایک پہلی نظر نے ہی ان دونوں کا کام تمام کر کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے، چاند ستاروں پر مکند ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی، کیوں کہ وہاں انسان کے قدم پہنچ چکے ہیں۔ صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہونے لگے ہیں۔ ہر کسی کو ہر لمحہ، ہر رابطہ میسر ہے۔ مشین ہماری زندگی پر حاوی ہو چکی ہے۔ محبت کی روایتی داستانوں کو لوگ گزرے دنوں کا قصہ کہتے ہیں۔ بہر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال اور شیریں فرہاد، الف لیلیٰ کی کہانیاں لگتی ہیں۔ محبت ڈیجیٹل ہونے لگی ہے۔ انسان عروج کی کتنی منزلیں طے کر چکا ہے، مگر یہ پہلی نظر..... یہ آج بھی اپنے اندر وہی زمانے بھر کے عجائبات چھپائے بیٹھی ہے۔ کوئی سائنس دان آج تک اس پہلی نظر کے ڈنک کا علاج نہیں ڈھونڈ پایا۔ کوئی تریاق دریافت نہیں ہوا، نظر کے زہر کا آج تک۔ ہر خرابی کی جڑ یہی ایک پہلی نظریں تو ہے۔ نئے زمانے کے نئے لوگ لا کھ انکار کریں، لا کھ مذاق اڑائیں، مگر سچ یہی ہے کہ محبت اور نظر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پھر چاہے یہ نظر کبھی بھی اور کسی بھی طور ہماری زندگیوں میں وارد ہو جائے، یہی معاملہ سکینہ اور سانول کے ساتھ بھی ہوا۔ دونوں ایک بار طے اور پھر ملتے ہی گئے۔ مگر ظالم زمانے کو بھلا یہ ملاپ کب بھاتا ہے، سماج سدا سے محبت کرنے والوں کا دشمن رہا ہے۔ سو، یہاں بھی وہی ہوا۔ علاقے کے کسی بندے نے سکینہ کو سانول سے ملتے ہوئے دیکھ لیا، بات پھیل گئی۔ سانول باقاعدہ رشتہ لے کر اپنے گھر والوں سمیت سکینہ کے گھر جانا چاہتا تھا، مگر اس کے نمبردار باپ کی انا ایک مزارع کے گھر رشتہ لے جانے کے آڑے آ گئی، ویسے بھی علاقے کا پٹواری اپنی بیٹی رضیہ کو سانول کے سنگ رخصت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور نمبردار بھی پٹواری کے گھر رشتہ کرنے کا خواہاں تھا۔ رنجو شکل و صورت میں بھی چندے آفتاب، چندے ماہتاب تھی، اور اس کے خوابوں میں بھی نہ جانے کب سے سانول بس رہا تھا۔ وہ تو اس کی یونیورسٹی کی ٹیچنوں کی دعائیں مانگتی پھرتی تھی، تاکہ اس کے دل نگر کا شہزادہ واپس گھر لوٹ سکے، مگر جب اسے پتا چلا کہ سانول اور سکینہ کی کہانیاں ریاست پور کے گلی کوچوں میں پھیل رہی ہیں، تو اس کے سینے پر بہ یک وقت کئی سانپ لوٹ گئے، جانے یہ محبت کی کہانیاں اتنی جلدی سارے زمانے میں کیوں اور کیسے پھیل جاتی ہیں؟ ورنہ ہر دوسری آفت آ کے گزر بھی جائے، ہم اس کی تباہی سے آخری وقت تک بے خبر رہتے ہیں۔ رضیہ جسے لاڈ سے سارے گھر والے رنجو کہتے تھے، اس لیے بھی بے چین تھی کہ اسے یقین تھا کہ بستی بھر میں صرف وہی ایک سانول کے جوڑ کی ہے، اس کے حسن کے چاند کے سامنے بھلا کسی اور کے روپ کا چراغ کیا جلے گا، مگر اس نے جو سوچا تھا، سب اس کے الٹ ہو رہا تھا۔ یہ معمولی سے کچی کمین گھرانے کی سکینہ کہاں اس کے سپنوں کی تجوری پر ڈاکا ڈالنے آ گئی تھی۔ رنجو کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طرح سکینہ کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اسے غم بھر کے لیے داغ دار کر دے۔ جانے علاقے کے سب سے وجیہہ نوجوان کو اس کے اندر کیا نظر آتا تھا؟ یہ رقیب بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں، جانے دنیا میں محبت پہلے اتری تھی یا رقابت؟ رقیب ہر لمحہ اپنے حریف کی سانسیں بند کر دینے کی فکر میں گھلتا رہتا ہے۔ رنجو کا بھی یہی حال تھا، اور پھر آخر کار اس کے دل کی مراد برآئی۔ سانول کی ماں نے اس کے سامنے اپنا دوپٹا ڈال دیا اور بہنوں نے اپنی چادریں پھیلا دیں کہ ان کی محبت اور مان کی خاطر وہ رنجو سے بیاہ کے لیے ہاں کر دے۔ دنیا میں چور اور ڈاکو دوسروں کے گھروں میں بڑے بڑے ڈاکے ڈالتے ہیں، مگر اس جہاں کا سب سے بڑا ڈاکا، یہ رشتوں کا ڈاکا ہوتا ہے۔ جو ہمارے ماں باپ، بہن بھائی اپنی محبتوں اور خدمتوں کی ڈھائی دے کر کسی اپنے ہی چہیتے کی محبت لوٹ کر مارتے ہیں۔ سانول بھی باپ کی ضد، ماں کے آنسوؤں اور بہنوں کی آہوں کے سامنے آخر کار مجبور ہو گیا اور اس نے اپنی ہی محبت کا خرمن جلا ڈالا، کہتے ہیں ریاست پور کی بڑی باراتوں میں سے ایک بارات تھی نمبردار کے بیٹے کی۔ سانول کی جنج کیا چڑھی، سکینہ کے دل کا دریا ہمیشہ کے لیے اتر گیا۔

شادی سے ایک رات پہلے سانول آخری بار سکینہ سے ملنے آیا۔ اس نے سکینہ کو اپنے دل کی حالت بتائی اور مجبور یوں کی ساری داستان بیان کی کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کی محبت کا اتنا مقروض ہے کہ جس کے سود کے طور پر ان دونوں کو اپنی محبت غم بھر کے لیے گروی رکھنی پڑے گی۔ سکینہ چپ رہی۔ محبت میں عورت اپنی مجبوری بیان کرے تو اس

پر دنیا بڑے سخت الزامات لگاتی ہے۔ بے وفائی کے طعنے اور سنگ دلی کے طعنے کیے جاتے ہیں۔ تیروں سے عورت کا سینہ چھلنی کر دیا جاتا ہے، مگر مرد جب محبت میں اپنی مجبوری بیان کرتا ہے، تو اسے اپنے رشتوں کا وفادار، زمانہ شناس اور مخلص کہا جاتا ہے۔ اس کی قربانیوں کے گلن گائے جاتے ہیں اور زمانہ اسے اپنی پلکوں پر بٹھاتا ہے۔ سانول بھی رنجو کی پلکوں کی ڈولی چڑھ گیا، سارا گاؤں ان دونوں کی خوب صورت اور بھلی جوڑی دیکھنے کے لیے اُمد آ یا تھا۔ ایسے لگتا تھا، جیسے دونوں کو بس قدرت نے ایک دوسرے کے لیے ہی تراشا تھا۔ دلوں کے حال تو خدا بہتر جانتا ہے، مگر کہنے والے کہتے تھے کہ سانول اور رنجو کی نظر ایک دوسرے سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھی۔ رنجو نے جب شادی کی رات سانول کے گھر میں پہلا قدم رکھا، تب ہی سے سانول کی ماں، بہنیں رنجو پر صدقے واری جاری تھیں۔ نصف شب تک رسمیں چلتی رہیں اور ماں بہنوں نے اپنے ویر شہزادے کی بارات کا ہر ارمان جی بھر کے پورا کیا۔ سارا محلہ سانول کے گھر کی طرف سے آنے والی شہنائیوں کی آواز اور ڈھول بتاشوں کی دھمک سے رات بھر گونجتا رہا۔ ان کے قہقہوں کی آواز سکینہ کے گھر کے آگن تک بھی آرہی تھی۔ سکینہ کا دل کبھی نہ پھٹا اگر ان ہنسی کی آوازوں میں خود اس کے اپنے محبوب کی آواز شامل نہ ہوتی۔ اس درد کا احساس صرف وہ کر سکتا ہے، جس نے زندگی میں کبھی خود محبت کی ہو۔ جگر کیسے چھلنی ہوتا ہے اور سینے سے جلتے دل کا دھواں کیسے نکلتا ہے، جب اپنا ہی سانول کسی اور سانوری کے ساتھ شپ عروسی منارہا ہو۔ سکینہ کے اندر بھی کچھ ایسا شور مچا کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا اور پھر اسے ایسی چپ گلی کہ لوگ اس کی آواز سننے کو بھی ترس گئے۔ جسم کے اندر بہتا خون سو کھتا چلا گیا۔ ہونٹوں سے مسکان کا رشتہ کچھ ایسے ٹوٹا کہ وہ سدا کے لیے مسکراتا ہی بھول گئی۔ محبت جب انسان کی شریانوں اور بہتی ٹسوں میں خون کے ساتھ دوڑتی ہو، تب وہی محبت روٹھ جانے پر، لبو کی روانی روک بھی دیتی ہے۔ خون صرف بہہ کر ہی خشک نہیں ہوتا، کبھی کبھی ٹسوں کے اندر بھی اپنا بہاؤ کھو بیٹھتا ہے۔ محبت کا مریض دن بہ دن لاغر اور کم زور ہوتا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے طبیب اس کے مرض کی شناخت ڈھونڈنے میں لگے رہتے ہیں، مگر مرض کا سرا نہیں ملتا، مریض سو کھ کر کاٹا ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر پرست حکیم اور وید اس کھوج میں گھلتے رہتے ہیں کہ آخر ہنا کوئی چوٹ لگے، ہنا کسی بیماری کے، اس مریض کا وزن دن بہ دن کم کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ گالوں کی ٹرفنی پیلاہٹ میں کیوں بدل رہی ہے، جسم کی شادابی خشک ہوتے پٹے کی طرح رخصت کیوں ہو رہی ہے۔ سکینہ کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا اور پھر تین چار ماہ کے اندر اندر وہ ایک چلتی پھرتی لاش بن گئی۔ اس کا محبوب اپنی نئی دنیا میں گمن تھا، ایک آدھ بار قصبے کے بازار یا کسی درگاہ، مزار پر سکینہ کا سامنا ہوا بھی، تو وہ نظریں پڑا گیا، یا شاید وہ سکینہ کو پہچان ہی نہ پایا ہو۔ یہ تو وہ سکینہ تھی ہی نہیں، جو کبھی اس کے دل کی رانی تھی۔ سکینہ بس سانول کو دیکھتی ہی رہ گئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔ آج بھی کتنا بانکا اور جھپٹا تھا اس کا محبوب، مگر رنجو کو کسی نوکرانی کی زبانی اس ٹکراؤ کی خبر ملی، تو وہ برداشت نہ کر پائی۔ اسے یوں محسوس ہوا، جیسے سانول اب بھی نچپ نچپ کر سکینہ سے ملتا ہے۔ رقیب ہمیشہ رقیب ہی رہتا ہے۔ محبوب کا درجہ پانے کے بعد بھی اس کے اندر پلٹے سدا کے شکوک و شبہات کبھی اسے اس اعزاز کا حق دار نہیں بننے دیتے۔ رقیب نے چوں کہ خود کسی کی محبت پر ڈاکا مارا ہوتا ہے، اس لیے وہ ساری زندگی خود ایسی کسی چوری سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس کی نیندیں اپنے خزانے کی حفاظت کی فکر میں اڑی رہتی ہیں۔ جلن اور حسد کے سانپ اسے ہمیشہ ڈستے رہتے ہیں۔ رنجو بھی کسی ایسی ہی تپش کا شکار تھی۔ وہ یہ بات نہیں بھولی تھی کہ کبھی سانول سکینہ پر مرتا تھا۔ دونوں کی محبت کے ہر سوچے چپے تھے۔ کون جانے کب سانول کے دل میں پھر سے پرانی محبوبہ کی محبت جاگ اٹھے۔ رنجو سوچ سوچ کر ہلکان ہو گئی، تو پھر آخر کار اسے وہ خوف ناک فیصلہ کرنا ہی پڑا، جو صرف ایک رقیب ہی کر سکتا ہے۔ فنا کر دینے کا فیصلہ، جو محبت کرتے ہیں وہ خود کو فنا کر لیتے ہیں اور جو رقیب ہوتے ہیں، وہ دوسروں کو مار کر اپنی محبت کی بقا ڈھونڈتے ہیں۔ رنجو نے علاقے کی نیاز کی رسم کے مطابق مٹوں دودھ خرید کر ساری بستی میں تقسیم کروایا۔ البتہ اس بانٹ میں بس ایک فرق تھا۔ سکینہ کے گھر جو دودھ کی مٹکی بھیجی گئی تھی، اس کے اندر علاقے کے سب سے زہریلے سانپ کا زہر حاصل کر کے چند بوندیں اس دودھ میں ملا دی گئی تھیں۔ سکینہ کی ماں نے مٹیل کی مٹکی سے دودھ نکال کر کنوری سکینہ کے سامنے رکھ دی۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رفقاء، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولے گا۔ ہمارا ہاتھ ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماں چاہتی تھی، اس کی مریض لاڈلی کے بے رونق چہرے پر کچھ رنگ آجائے، شاید اس تازہ اور میٹھے دودھ کی تاثیر ہی سے کچھ پل کے لیے اس کی نڈھال سی ڈلاری توانائی محسوس کرے۔ سکینہ نے دودھ کی کنوری اٹھا کر منہ سے لگائی ہی تھی کہ باہر سے اس کے بوڑھے باپ کے کھانسنے کی آواز سنائی دی، مگر دوسری آواز سن کر تو جیسے اس کی پوری کی پوری روح ہی جھنجھٹا گئی۔ یہ تو سانول کی آواز تھی۔ ہاں..... اسی سانول کی جس کی محبت نے اس کی روح کے ریشے ادھیڑ کر رکھ دیئے تھے۔ سکینہ کے ہاتھ میں کنوری کچھ ایسے لرزی کہ سارا دودھ کپڑوں پر چھلک گیا۔ سکینہ نے کنوری نیچے رکھ دی اور خود پردے کی اوٹ سے باہر ہونے والی بات چیت سننے لگی۔ پتا چلا کہ سانول کسی کام سے سکینہ کی گلی سے گزر رہا تھا کہ سکینہ کے باپ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پرائی باتوں اور یادوں کا سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ گلے شکوے زبان تک آگئے۔ سانول نے سکینہ کے باپ کو یقین دلایا کہ وہ آج بھی خود کوان کے گھرانے کا ایک فرد سمجھتا ہے، مگر سکینہ کا باپ بغد ہو گیا کہ اب ملاقات ہو ہی گئی ہے، تو دو گھڑی اس کے گھر کے صحن میں بیٹھ کر انہیں عزت بخشے۔ سانول نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی، مگر اس کی ایک نہ چلی۔ سکینہ کی ماں جو دل ہی دل میں ہمیشہ ہی سانول کو اپنے داماد کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند تھی، اُسے گھر میں پا کر ایک بار پھر اپنی ناکام آرزو کا غم لیے سانول کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ گھر میں اور کچھ تو تھا نہیں پیش کرنے کے لیے، رنجو کے گھر سے آئی دودھ کی مٹکی ہی میں سے ایک کنوری نکال کر سانول کو تھمادی، جو اس نے ایک سانس میں حلق سے نیچے اتار لی اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ سکینہ کا سامنا کرنے کے خیال سے گھبرا رہا تھا، مگر سانول دروازے تک بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ سارے گھر میں بھونچال سا آگیا، سبھی سانول کی جانب لپکے، سکینہ بھی ساری لاج شرم بھلا کر دروازے کی جانب دوڑی۔ سانول کے ہونٹوں کے کنارے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر نے زمین پر گلال بکھیر دیا تھا۔ سانول اور سکینہ کی نظر آخری بار ٹکرائی، اُن دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُداسی تھی۔ سانول کو کچھ کہنے اور سکینہ کو کچھ سننے کی مہلت ہی نہ ملی اور سانول نے وہیں سکینہ کے سامنے دم توڑ دیا۔ ایک قیامت آگئی، سکینہ پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ سکینہ کے باپ اور گھر کے باقی مردوں کو علاقے کی پولیس قتل کے الزام میں دھر کر لے گئی۔

رنجو کو جب سانول کی موت کا پتا چلا، تو اس نے لمبے بھر ہی صحن میں بنے کنوئیں کی منڈیرناپ کر گہرائی میں چھلانگ لگا دی۔ خوش قسمتی سے گھر کی نوکرانی نے بروقت اطلاع کر دی اور رنجو کو زندہ کنوئیں سے نکال لیا گیا، مگر وہ زندہ کب تھی۔ نہ جانے سانس کی روانی اور دل کے دھڑکنے کو زندگی کا نام کیوں دے دیتے ہیں لوگ.....! سات دن بعد رنجو کا سکتہ ٹوٹا تو وہ پہلی بار ٹوٹ کر روئی۔ اُسے پتا چلا کہ سکینہ کے گھر والوں نے جلن اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے، سانول کو دودھ میں زہر ملا کر مارا۔ ساری بستی یہی سمجھتی تھی کہ یہ حرکت سکینہ کی ہو سکتی ہے، جس پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کے گھر والوں نے خود کو قربانی کے بکرے کے طور پر پولیس کے حوالے کر دیا، تو رنجو نے اپنی عدت کی پروا بھی نہیں کی اور سیاہ چادر اوڑھ کر سکینہ کے گھر پہنچ گئی۔ سکینہ اور رنجو کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کو ٹکڑ ٹکڑ دیکھتی رہیں اور پھر رنجو یوں لپک کر سکینہ کے سینے سے جا لگی، جیسے برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں۔ دونوں کچھ ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ مانوسلاب آگیا۔ صرف وہ دونوں ہی دنیا میں ایسی تھیں، جو ایک دوسرے کے دل کا درد سمجھ سکتی تھیں۔ اُن دونوں کا محبوب اُن سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی رقیب تھیں، مگر رقیب سے زیادہ محبت کے بچھڑنے کا دکھ بھلا کون جانتا ہے۔ یہاں محاورے نا نہیں حقیقتاً دونوں کا غم ایک تھا۔ صرف وہی دونوں اس کرب کی کاٹ اور جان لیوا عذاب سے واقف تھیں۔ رنجو نے پولیس کو اپنا پتا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ سکینہ کے گھر والے رہا ہو گئے اور رنجو سلاخوں کے پیچھے چلی گئی، مگر اس محبت کی بھٹی نے سکینہ کو کچھ ایسا جلایا کہ وہ سب کرکندن ہو گئی۔ ایک ایسا پارس بن گئی، جس سے چھو کر لوہا تولوہا، مٹی بھی سونا بنتی گئی۔ اسے شاید یہ اعزاز اس لیے ملا کہ اس نے خود اپنے لیے دنیا ترک کر چھوڑی تھی۔ اس کے ہاتھ جب بھی اٹھے یا اس کے لب جب بھی گھلے، صرف اوروں کے لیے ہی گھلے، خود اپنے لیے کچھ بچا ہی کب تھا کہ وہ مانگتی۔ شاید ہم جب کسی دوسرے کے لیے اپنے خدا سے کچھ مانگتے ہیں، تب ہم خلوص، عاجزی اور بندگی کی اس معراج پر ہوتے ہیں، جو دنیا کی ہر دُعا کی قبولیت کا آخری پیمانہ ہے۔

نصف شب ڈھل چکی تھی۔ خانہ بدوش، بنجاروں کا جلایا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا۔ بنجارے نے آخری تان لگائی اور محفل برخاست کر دی۔ جانے اُس لمحے پھر مجھے شدت سے یہ احساس کیوں ہوا کہ میں خود بھی تو ایک بنجارہ ہوں اور وہ مجسمہ ساز کسی چاند نگر کی شہزادی تھی۔ بنجاروں کی پہنچ شہزادیوں تک بھلا کب ہوتی ہے۔ مٹی کے کھلونوں کے بدلے روپ کا سونا کون بیچتا ہے؟ روپ کے سودے صرف روپ کے بدلے ہوتے ہیں اور جو مجھ جیسے بے روپ، بد صورت ہوتے ہیں، اُن کے ہاتھ صرف خاک ہی آتی ہے، خاک کے بدلے خاک! شکورا اور مہر دین سکینہ کو لے کر واپس جانے لگے، تو میں نے شکورے سے کہا۔ ”اتنا کچھ ہو چکا ہے اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا، پھر بھی تمہاری یہ خواہش ہے کہ تمہاری نوا سی ہنسے بولے اور پھر سے عام زندگی جئے.....؟“ شکورہ اشرمندگی کے مارے سر جھکائے کھڑا رہا۔ مہر دین نے اس کی مدد کی۔ ”یہ ساری بھلا بتانے کی باتیں ہیں سائیں جی! اشرمندگی ہی اشرمندگی ہے اور پھر تم سے کون سی بات چھی ہے سائیں! یہ

نیاڑاں تو بس اتنا چاہتا ہے کہ اس کی سکینہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ڈولی چڑھ کر اپنے لاڑے کے ساتھ رخصت ہو جائے، اس کا بھی گھر بار ہو، پال بچے ہوں، یہ باتیں سب کے سامنے کہنے والی تو نہیں ہیں ناں سائیں جی.....! بس تم دعا کرو ہماری سکینہ کے لیے۔“ میں نے سر جھکائے کھڑی سکینہ پر ایک نظر ڈالی۔ ”یہ مجھ جیسے برائے نام اور دکھاوے کے سائیں بابوں کی دُعا سے بہت آگے جا چکی ہے مہر دین! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کی خوشی اور اس کے غم کے معیار اس دنیا کی روایت سے بہت جدا ہیں، اگر تم دونوں اس کی خوشی چاہتے ہو، تو اس سے کہو کہ خود اپنے لیے خوش حالی اور اچھے گھر بار کی دعا کرے، یہ اگر مان گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا، ورنہ اسے زیادہ تنگ نہ کرنا۔ یہ جس حال میں خوش رہے، تم سب اسی کی خوشی میں خوش رہنا۔“ مہر دین اور شکور اسر جھکائے چپ چاپ سکینہ کو وہاں سے لے کر چلے گئے۔ کچھ دیر ہی میں صبح کا اُجالا پھیلنے لگا۔ سورے سے انگڑائی اور انگڑائی سے زندہ کی جانے کا استعارہ جو ڈیا گیا ہے۔ سکینہ کی بستی بھی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی، گھروں سے مرغوں کی بانگیں اور چھتوں کی چمنیوں سے زندگی کی نوید دیتا دھواں آسمان کی طرف بلند ہونے لگا۔ ان سارے دیہات، قصبوں اور بستیوں کی صبح ایک جیسی ہوتی ہے، شہروں کی طرح ایک جھٹکے سے نہیں، بلکہ دھیرے دھیرے جاگنے والی، سرکتی، پھیلتی دھوپ کی طرح آہستہ آہستہ بستی کے در و بام اور آنگنوں میں اترنے والی.....! میں نے کسی گزرتے راہ گیر سے سانول کی قبر کا پتا پوچھا اور قبرستان جا کر فاتحہ پڑھ آیا۔ قبر کے قریب کچی زمین پر مجھے بہت سی آڑی تر چھی لکیریں کھینچی نظر آئیں، ویسی ہی لکیریں جیسی سکینہ نے میرے ڈیرے کی زمین پر کھینچ رکھی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں ساری بستی کو اکٹھا کر کے انہیں یہ نوید سنادوں کہ اب انہیں اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لیے کسی فقیر یا مجذوب کی حمایت کی ضرورت نہیں، وہ وہاں تھے، ہتھیلیوں کا چاند تو خود ان کی بستی کے ایک کچے گھر میں روشن ہے، مگر یہ سدا کے تو ہم پرست لوگ بھلا میری بات پر کہاں یقین کریں گے، ہاں اگر سکینہ کسی چوہدری، وڈیرے یا نمبردار کی بیٹی ہوتی، تو یہی لوگ آنکھیں بند کر کے میرے ہر جھوٹ پر بھی یقین کر لیتے اور اس وقت تک سکینہ کی حویلی کے باہر ضرورت مندوں کی بھیڑ لگ چکی ہوتی۔ میں آج تک کبھی یہ بات نہیں سمجھ پایا تھا کہ ہم انسان دُعا کی قبولیت کے لیے اپنے جیسے زندہ یا مردہ انسانوں کی سفارش یا وسیلہ کیوں ڈھونڈتے ہیں، ہم اپنے رب سے براہ راست کچھ مانگتے ہوئے اتنا جھجکتے اور شرماتے کیوں ہیں؟ یہ کیسی بے یقینی ہے ہمارے اندر، یا شاید یہ بھی مایوسی کی ایک قسم ہے، مگر مایوسی کو تو کفر قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ سارے بے یقین بھی اپنے اعتبار کے کافر ہیں.....؟

ڈیرے پر واپس پہنچنے سے پہلے میں یہ طے کر چکا تھا کہ ایک آدھ ہفتے میں یہاں سے کوچ کر جاؤں گا کہ میں اب اس ڈھونگ کا بوجھ مزید نہیں اٹھا سکتا تھا۔ واپس آ کر میں نے دو گھڑی سستانے کے لیے کمر لگائی ہی تھی کہ مہر دین کا پوتا اپنی چھوٹی سی سرخ سائیکل دوڑاتے، ہانپتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”سب خیر تو ہے کا کے.....؟“ بچے نے مجھے چاروں طرف گھوم پھر کر یوں دیکھا جیسے تسلی کر رہا ہو کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں!“ کچھ نہیں سائیں جی! دادے نے کہا تھا کہ جا کر دیکھو سائیں جی ٹھیک ٹھاک ہے کہ نہیں..... بس اب میں چلا۔“ وہ جیسے آیا تھا، ویسے ہی تیز تیز پیڈل چلاتے وہاں سے بھاگ گیا۔ یہ بچے بھی اپنی دنیا میں رہنے والے مست ملنگ ہی ہوتے ہیں، اپنی رمزیں خود ہی جانتے ہیں۔ جانے مہر دین نے اسے کس کام سے بھیجا تھا اور وہ کیا سمجھا تھا، مگر دو پہر ڈھلتے ہی مہر دین خود بھی شکورے کے ساتھ ہڑ بڑایا ہوا سا وہاں آن پہنچا۔ اُن دونوں کے چہرے پر لکھی پریشانی کی لکیریں دُور سے پڑھی جاسکتی تھیں۔ ”سائیں جی! سب خیری صلا ہے ناں.....؟“ ”ہاں میں ٹھیک ہوں مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو.....؟“ ان دونوں سے کوئی بات ٹھیک سے جڑ نہیں پائی۔ ”وہ جی سکینہ نے آج صبح یہاں سے واپس جا کر تمہارے لیے بہت بُرا سُننا دیکھا ہے۔“ میں ہنس پڑا۔ ”بس اتنی سی بات ہے، تم دونوں سکینہ کے بُرے سنے سے گھبرا کر یہاں دوڑے چلے آئے..... میری زندگی پہلے ہی کسی بُرے خواب سے کم نہیں ہے، جاؤ جا کر سکینہ سے کہہ دو کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میرے لیے فکر مند نہ ہوا کرو تم لوگ.....! کچھ نہیں ہو گا مجھے!“ لیکن میری اس بے فکری کا اُن دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شکور ابولا۔ ”بات اتنی سادی نہیں ہے جی! سکینہ کے خواب سچے ہوتے ہیں سارے..... جب سے سانول کی موت ہوئی ہے، اس کا کوئی خواب جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔“ میں نے ان دونوں کو تسلی دی۔ ”مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں ہو، آخر اس نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے خواب میں.....! میرے پاس کھونے کے لیے اب باقی کچھ نہیں بچا ہے۔“ شکورے نے گہری سانس لی۔ ”سائیں جی! اب میں کیا بتاؤں تمہیں، میری تو زبان جلتی ہے بولتے ہوئے، سکینہ نے خدا نخواستہ تمہاری موت دیکھی ہے..... اس نے خواب میں دیکھا کہ ہمارا سائیں فوت ہو گیا ہے اور ہم سب اس کے لیے کفن دفن کا انتظام کر رہے ہیں۔“ مہر دین نے شکورے کو سختی سے گھورا اور شکور اگھبرا کر خاموش ہو گیا۔ وہ دونوں کافی دیر میرے قریب بیٹھے رہے، جیسے انہیں خوف ہو کہ ان کے جاتے ہی مجھے کچھ ہو جائے گا۔ پتا چلا کہ سکینہ کے ہر خواب کی تعبیر تب سے سچی ہوتی ہے، جب سے سکینہ خود ایک خواب رفتہ جیسی زندگی گزار رہی ہے۔ جب شام گہری ہونے لگی، تو میں نے انہیں زبردستی واپس بھیج دیا، ورنہ ان دونوں کا ارادہ اُٹھنے کا نہیں لگ رہا تھا۔

اندھیرا ڈھلا تو میرے دل کے اندھیرے بھی میرے ارد گرد رقص کرنے لگے۔ چلو اچھا ہوا، سکینہ نے مجھے میرا انجام کچھ پہلے ہی بتا دیا، ورنہ خود میں اس انجام کے لیے ہمیشہ سے تیار تھا، کہانی ختم ہونے کا وقت آپہنچا تھا۔ میں خود بھی بہت تھک چکا تھا اس بھاگ دوڑے، اب لمبی نیند سونے کو جی

چاہتا تھا۔ رات ڈھلی تو میں نے یہی سوچ کر آنکھیں موند لیں کہ اب یہ آنکھیں شاید کبھی نہ کھلیں، مگر حشر تک کی نیند شاید ابھی میرا مقدر نہیں تھی۔ پرندوں کی چچہاہٹ اک نئی صبح کی نوید لے کر آئی تھی، مگر میری آنکھ کھلنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ دُور سڑک کے کنارے ایک بڑی امپورنڈ گاڑی کا بوٹ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیور سمیت ایک دوسرا شخص بوٹ پر جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک تیسرا محافظ نما شخص قریبی جو ہڑ سے پانی کا ایک کین بھر کر لایا اور ڈرائیور نے پانی گاڑی کے ریڈی ایٹر میں ڈال دیا۔ میں نے بے زاری سے چہرہ موڑ کر آنکھیں بند کر لیں، مگر پھر اچانک ایک مانوس سی آواز نے میرے وجود میں بجلیاں سی بھر دیں۔ وہ ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔ ”اور کتنا دیر لگے گا کم بخت..... سارا دن لگائے گا کیا.....؟“ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بوٹ پر جھکا ہوا دوسرا شخص کبیر خان تھا۔ ہاں وہ کبیر ہی تھا، جو کبھی میرا محافظ ہوا کرتا تھا۔ جانے وہ اس دیرانے میں کیا کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے کچھ کہا اور پھر

اچانک اس کی نظر دُور بیٹھے مجھ پر پڑی۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ میں کبیر سے خاصے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے ماضی اور حال کے حلیے میں زمین آسمان کا فرق تھا، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں کبیر کی نظریں مجھے اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا، مگر میں نے لا تعلقی سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کبیر خان نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں کسی بھی بہانے وہاں سے اٹھ کر دوسری جانب چل پڑوں گا۔ کبیر نے اپنے ساتھ کھڑے محافظ سے کچھ کہا اور محافظ سر ہلا کر میری جانب چل پڑا۔ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ اچھا ہوا کہ کبیر خود میری طرف نہیں آیا، ورنہ وہ میری آواز ضرور پہچان لیتا۔ محافظ نے میرے قریب آ کر سلام کیا اور جیب سے میری ہی ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ ”باباجی! ان صاحب کو یہاں آس پاس کہیں دیکھا ہے آپ نے.....؟“ میں نے بظاہر لا پرواہی سے تصویر پر ایک اچنتی سی نگاہ ڈالی اور آنکھیں موند کر جواب دیا۔ ”یہ تو کوئی بڑا آدمی لگتا ہے اپنے حلیے سے..... اس چھوٹے سے گاؤں میں بھلا اس کا کیا کام..... کون ہے یہ آدمی.....؟“ محافظ نے گہری سانس لی۔ ”یہ میرے صاحب کے صاحب ہیں، بہت عرصہ پہلے کہیں چلے گئے تھے سب چھوڑ چھاڑ کر.....! ہم تب سے انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔“ میں نے چور نظروں سے محافظ کی طرف دیکھا، مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا، شاید کبیر یا کمالی کے ذاتی عملے کا کوئی ملازم ہو گا۔ بہر حال وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے میرے قریب یوں دیر تک بیٹھے رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کبیر کسی لمحے بھی میری طرف آسکتا تھا یا پھر شاید اسی شخص کو میری بڑھی ہوئی داڑھی اور لٹوں کے پیچھے میرے ماضی کی کوئی جھلک نظر آجاتی، لہذا میں نے وہاں سے اٹھ جانے ہی میں بہتری جانی۔ ”تم لوگ یہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو، یہاں آس پاس کی سبھی بستیوں میں اپنی زندگی کے بہت سے سال گزار چکا ہوں، سبھی جگہ آنا جانا لگا رہتا ہے، یہ شخص کبھی یہاں نہیں آیا، جاؤ کہیں اور تلاش کرو..... میں ذرا ڈیرے کے لیے پانی بھراؤں۔“ محافظ بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں مخالف سمتوں کی جانب چل پڑے۔

میں نے کچھ دُور جا کر ایک درخت کی اوٹ سے ٹھپ کر دیکھا تو محافظ اور کبیر آپس میں کچھ بات کر رہے تھے، پھر وہ تینوں گاڑی میں سوار ہو گئے اور ریاست پور سے مخالف سمت میں آگے بڑھ گئے، لیکن میں کبیر خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اتنی جلدی ہار مارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ آج نہیں، تو کل وہ اس راستے پر ضرور پلٹتا۔ میرے دل میں یہ خدشہ ہمیشہ سے موجود تھا کہ میرے یوں چلے جانے کے بعد وہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے ہوں گے اور پھر کبیر خان جیسا وفادار تو کبھی تک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے ہر وہ جگہ چھان ماری ہو گی، جہاں میری موجودگی کا ذرہ برابر بھی امکان رہا ہو گا۔ میرا دل ایک بار شدت سے مچلا کہ میں ایک لمحے کے لیے کبیر کو روک کر عینی کے بارے میں پوچھ لوں، پھر میں اسے اپنی قسم دے کر منالیتا کہ وہ کبھی کسی کے سامنے میرا ذکر نہیں کرے گا، مگر پھر میں نے خود ہی اپنے اندر کے اس اُبال پر قابو پا لیا۔ کبیر مجھے اپنے ساتھ لیے ہٹا کبھی واپس نہ جاتا، یا پھر خود بھی غم بھر کے لیے یہیں ڈیرے ڈال دیتا۔ ان کے جانے کے بہت دیر بعد تک بھی میرے دل کی دھڑکنیں معمول پر نہیں آئیں، سب کچھ دوبارہ سے تازہ ہو گیا، میرے دل و دماغ میں.....! یادیں کبھی پُرانی نہیں ہوتیں، یاد ماضی کو بھلانا صرف دل بہلاوے کی باتیں ہیں، چاہے ہم ساری غم بھی اپنی یادوں سے فرار لے کر بھاگتے رہیں۔ ہم جہاں تھک کر گرتے ہیں، وہیں سے یادوں کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ کبیر خان کی آمد نے میرے لیے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ اب میرا یہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کبھی بھی واپس پلٹ سکتا تھا۔ میں نے مہر دین کے ذریعے شکورے کو بلا بھیجا۔ میری امید کے مطابق سکینہ بھی شکورے کے ساتھ چلی آئی، شاید شکورے نے اسے بھی میری روانگی کے خدشے سے آگاہ کر دیا تھا۔ سکینہ میرے لیے کافی فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”میری فکر نہ کرنا، میں بہت پہلے مر گیا تھا، اب صرف تصدیق ہونا باقی ہے، ہو سکے تو اپنے ماں، باپ اور نانا کی خاطر کسی بہتر اور نیک بندے کو اپنا بیویون ساتھی چن لینا، میں جانتا ہوں تمہارے لیے وہ دُہری زندگی جینا بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہو گا، مگر یہ دنیا اپنے لگے بندھے اصولوں پر چلتی ہے، سو، جیسا دیس ہے، ویسا بھیس اپنالو۔“ میں نے شکورے اور مہر دین کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ بستی میں میری روانگی کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ رخصت ہوتے وقت ہم چاروں کی آنکھیں نم تھیں، وہی کچھ جھوٹے وعدے ہوئے پھر سے ملنے کے، جلد لوٹ آنے کے، سدا ایک دوسرے کو یاد رکھنے کے.....! جانے یہ آخری ملاقاتیں ہمیں اتنا جھوٹ بولنے پر کیوں مجبور کر دیتی ہیں، جب کہ رُکنے والے اور جانے والے دونوں ہی جانتے ہیں کہ یہ اُن کی آخری ملاقات ہے۔

صبح منہ اندھیرے میں وہاں سے چل پڑا۔ بڑی سڑک پر آتے ہی مجھے بس مل گئی۔ میں چپ چاپ سر جھکائے آخری سیٹ کے ایک کونے پر جا کر بیٹھ گیا۔ بس دیہاتیوں سے کچھا کچھ بھری ہوئی تھی۔ گھنٹہ بھر ہچکولے کھانے کے بعد اچانک ہی گاڑی رُک گئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا، آگے پولیس کانا کہ لگا ہوا تھا۔ دو پولیس والے اوپر چڑھ آئے۔ اُن کی باتوں سے لگتا تھا، جیسے وہ کسی خاص شخص کی تلاش میں ہیں۔ اتنے میں ان میں سے ایک کی مجھ پر نظر پڑی۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور پھر زور سے چلا یا۔ ”یہ تو یہاں بیٹھا ہوا ہے۔“

(جاری ہے)



..... ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رشتوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہوا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

پولیس والے کے اس طرح چلانے پر بس میں بیٹھے سارے دیہاتیوں نے گھبرا کر یوں پلٹ کر میری طرف دیکھا، جیسے بس میں کوئی جنگی بمبنا گھس آیا ہو۔ کچھ ہی دیر میں میرے ارد گرد کئی سپاہی بدوقیم تانے کھڑے تھے، مجھے بس سے اتار کر سڑک کنارے کھڑ کر دیا گیا، مگر میں نے ایک بات محسوس کی کہ پولیس والے میرے قریب آنے سے کترارہے تھے اور میری ہر جنبش پر ان کی مسلسل اور کڑی نظریں جمی تھیں۔ پھر انہوں نے مجھے انتہائی سختی سے ہاتھ فضا میں بلند کر کے کھڑے رہنے کا حکم دے دیا۔ کچھ دیر میں ان کا ایک افسر سرکاری جیب میں وہاں نمودار ہوا، اور اس نے بس کے ڈرائیور اور مسافروں کے نام، پتے نوٹ کرنے کے بعد بس کو جانے کی اجازت دے دی، اس کے کاندھوں پر سب سے بھول بتا رہے تھے کہ وہ انسپٹر ہے۔ اس کے ماتحتوں نے اسے زوردار سلامی دی اور کچھ کھسر پھسر کی۔ انسپٹر نے پہلے سر سے پاؤں تک مجھے کئی بار غور سے دیکھا، پھر اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔ ”اس کی تلاشی لی ہے.....؟“ ”نہیں صاب جی..... ہم جانچ والے آلے کا انتظار کر رہے تھے۔“ انسپٹر نے غصے سے انہیں جھاڑا ”اوئے..... اس ویرانے میں بارود جانچنے والا آلہ تمہارا مال لے کر آئے گا۔ ویسے کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ یہ وہی خود کش ہے، جس کی مخبری ہوئی تھی؟“ ”صاب جی! حلیہ تو بالکل وہی ہے۔ وہی لمبے بال، گھنی ٹٹوں جیسی بڑی داڑھی، سرخ آنکھیں، منگ کا بجیس..... یہ تصویر دیکھیں ذرا۔“ سب انسپٹر نے جیب سے ایک سادہ کاغذ پر بنا خاکہ نکال کر انسپٹر کو دکھایا۔ ان کی باتوں سے مجھے اتنا تو پتا چل چکا تھا کہ انسپٹر علاقے کا تھانے دار ہے، اور وہ کسی خود کش کی تلاش میں یہاں ناکہ لگائے بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ ہوا میں کھڑے کھڑے اکڑنے لگے، تو میں نے تھانے دار کو پہلی بار مخاطب کیا۔ ”اگر آپ اجازت دیں، تو میں اپنے ہاتھ نیچے کر لوں، میں ایک فقیر ہوں۔ ریاست پور سے آرہا ہوں۔ آپ چاہیں تو تصدیق کروالیں۔ میں کوئی دہشت گرد نہیں۔“ میری آواز سن کر وہ سارے یوں اچھلے، جیسے میں نے واقعی کوئی خود کش دھماکا کر دیا ہو۔ تھانے دار میری بات سے زیادہ میرے لہجے اور سکون بھرے انداز سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے قیص اتارنے کو کہا۔ میں نے اپنا پھنپا رانا چولا اتار کر ایک جانب پھینک دیا۔ کچھ دیر تک وہ سارے دُور کھڑے میرا جائزہ لیتے رہے، پھر تھانے دار کے اشارے پر ایک سپاہی نے مستعدی سے آگے بڑھ کر میری مشکلیں کس دیں اور پوری طرح جامہ تلاشی لی، تو تھانے دار سمیت سب نے اطمینان کا سانس لیا اور میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔ میرے تھیلے سے انہیں صرف کچھ چنے اور گڑی ملا تھا۔ تھانے دار نے جیب کے وائرلیس سیٹ پر اپنے کسی سینئر سے بات کی اور مجھے قیص پہننے کا حکم دیا۔ دُور ویرانے میں سامنے سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے کیمپن نما کھوکھ والے نے تھانے دار کے لیے اہلتی ہوئی دودھ پتی چائے کی ایک چھینک اور چند چھوٹے پُرانے سے شیشے کے گلاس بھجوا دیئے اور وہیں درخت تلے کرسی لگا کر تھانے دار کا دفتر بنا دیا گیا۔ ان چھوٹے علاقوں میں صدر اور وزیراعظم سے زیادہ تھانے دار کا کردار ہوتا ہے۔ انسان غلام پیدا ہوا ہے اور سد غلام ہی رہے گا، کبھی اپنی خواہشوں کا اور کبھی اپنے جیسے انسانوں کا۔ تھانے دار نے ازراہ کرم مجھے بھی سائے میں اپنے سامنے زمین پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ”جب تک ریاست پور سے تمہاری بات کی تصدیق نہیں ہو جاتی، تم زیر حراست رہو گے۔ ویسے تمہارا یہ صاف لہجہ اور بات کرنے کا انداز مجھے شک میں ڈال رہا ہے کہ تم ہمایہ ملک کے کوئی جاسوس ہو۔ اس علاقے میں کسی کا لہجہ اتنا صاف نہیں اور یہ تمہارے حلیے سے میل بھی نہیں کھاتا..... ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کون ہو.....؟“ میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسوں، کل تک جس حلیے اور بھیس کی وجہ سے یہ دنیا میری راہ میں پلکیں بچھاتی تھی، میری طرف پیٹھ کر کے چلنے کو بھی بے ادبی سمجھتی تھی، آج وہی حلیہ اور جوگی کا بھیس مجھے ایک عادی مجرم ثابت کرنے پر ٹھلا تھا۔ سکینہ کے حصار سے نکلتے ہی اس کی برکت کے اثرات ختم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ چالیس میل کا فاصلہ خاص ہجرت کی مسافت کو مکمل کرتا ہے۔ جیسے چالیس دن کا چلہ تبلیغ یا دوسرے روحانی عوامل کے لیے بہت اہم ہے۔ شاید کچھ شخصیات کا حصار بھی کسی خاص شخص کی ذات پر چالیس کے ہندسے سے مشروط رہتا ہو۔ میں نے بے خیالی میں تھانے دار سے پوچھا ”یہاں سے ریاست پور کتنی دُور ہے.....؟“ تھانے دار نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”پنشنٹھ میل، کیوں؟ مگر تم فکر نہ کرو، ہمارا وائرلیس پر رابطہ ہے۔ ابھی گھنٹے بھر میں تمہاری اصلیت سب کے سامنے آ جائے گی۔“ تھانے دار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر دوسری آنے والی جیب میں بٹھا کر تھانے پہنچا دیا جائے۔ ان میں سے کچھ تازہ بھرتی شدہ نوجوان سپاہیوں نے شاید آج تک کوئی دہشت گرد یا خود کش نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ مجھے کسی عجوبے کی طرح برت رہے تھے۔ خود کش.... ہم بھی کیسے بد قسمت معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ہماری لغت میں جانے کب سے ایسے ہی نئے لفظ شامل ہوتے آرہے ہیں۔ خود کش، دہشت گرد، درانداز، انتہا پسند، کوئی ایک اچھا نیا لفظ بھی تو نہیں ہمارے مقدر میں۔ ساری دنیا میں انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی راحت کے سامان کے لیے دن رات جُتار رہتا ہے۔ مگر نہ جانے ہم ایک دوسرے سے محبت کرنا کب سیکھیں گے؟ کب ہماری لغت میں دہشت کش، محبت پسند، سکون اندوز نامی لفظ شامل ہوں گے۔ ہم جینا کب سیکھیں گے؟

مجھے تھانے پہنچا دیا گیا۔ خلاف معمول تھانے کی عمارت باہر سے بڑی پُر سکون اور خوب صورت تھی۔ تھانے کے سامنے صاف پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی، جو تھانے کی عمارت کے آس پاس پھیلے وسیع و عریض اور سرسبز کھیتوں کو سیراب کرنے کے کام آتی ہوگی۔ تھانے کے پس منظر میں دُور پہاڑوں پر سورج کی دھوپ نے سونا پھیلا رکھا تھا۔ نہر کے اوپر ایک چھوٹا سا اینٹوں کا پل تھا، جو تھانے کے مرکزی چوٹی گیٹ کو باہر کی سڑک سے ملاتا تھا۔ جس کے عقب میں تھانے کی پرانی، مگر انگریز دور کی ایک پُر شکوہ عمارت استادہ تھی۔ اسی لمحے میں نے ایک عجیب بات محسوس کی کہ یہ ظاہر پُل اور دیواریں ایک جیسے اجزاء اور ساخت کی بنی اینٹوں سے تعمیر ہوتے ہیں، مگر ”پُل“ ملاپ کا استعارہ ہوتے ہیں، جب کہ دیواریں جدائی کی علامت بن جاتی ہیں۔ پُل لوگوں کو ملاتے ہیں اور دیواریں جدائیاں ڈال دیتی ہیں۔ تھانے کی اونچی لمبی دیواروں نے بھی میرے اور باقی دنیا کے درمیان جدائی کی فاصلہ کھڑی کر دی اور مجھے ایک حوالاتی کمرے میں بند کر دیا گیا، جو تھانے کے صحن میں دھوپ کے رُخ پر بنا ہوا تھا۔ شاید یہ بھی قیدی کو اذیت میں رکھنے کا ایک طریقہ ہو؟ ہم انسان اپنے جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے کتنے زیادہ طریقے ایجاد کر لیتے ہیں۔ راحت دینے کے لیے ہمارے پاس تھوڑا سا بھی وقت نہیں بچتا۔ شام ڈھلے تک میں وہیں حوالات میں بیٹھا آتے جاتے سپاہیوں اور دیگر سالکوں کو دیکھتا رہا۔ شام کو عصر کے بعد ایک سپاہی نے کم دودھ،

زیادہ پانی والی پتی سی چائے کا ایک پیالہ مجھے پکڑا دیا۔ ”جانتے ہو، دہشت گردی کی سزا کیا ہے؟ اگر تم پر الزام ثابت ہو گیا، تو سیدھے سولی چڑھ جاؤ گے۔ کیوں خود کو ہلاکت میں ڈال دیا تم نے؟“ لمبے بھر ہی میں مجھے سکینہ کی پیش گوئی یاد آ گئی، تو گویا میری فحاش دہشت گردی کے الزام میں سولی چڑھ جانے سے عبارت ہے۔ چلو، یونہی سہی۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا کہ تھانے دار نے میرے ورثاء کے طور پر ریاست پور سے شکورے اور مہر دین کو بلا کر میت ان کے حوالے کر دی ہے، کیوں کہ تھانے دار کو میں پہلے ہی ریاست پور میں اپنی جان پہچان کا اشارہ دے چکا تھا۔ میرے بارے میں مزید تو یہ کچھ جانتے نہیں تھے۔ قدرت اپنے مسودے مکمل اور کسی بھی غلطی یا جھول سے پاک لکھتی ہے۔ میں نے اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔ قضائے میرے گرد اپنا جال مکمل بن لیا تھا۔ اب تو شکون ہی شکون تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور وہ ناز ادا چہم سے میری بند آنکھوں کے پردے پر آ بیٹھی۔ کاش! میں ایک بار اسے دیکھ پاتا۔ میرا دل کسی نادان بچے کی طرح مچل سا گیا، جیسے ننگے پاؤں..... پھٹے پرانے کپڑوں والے بچے..... اپنی خالی جیبوں کا احساس لیے..... دل کو اچھی لگنے والی..... مہنگی چیزیں..... کسی دکان کے بند شیشوں سے..... پہروں لگ کر نکلتے ہیں ناں..... میں بھی تم کو یوں ہی محسن..... کٹر تنکتر رہتا ہوں۔

میں بھی اسی خالی جیبوں والے بچے کی طرح اُسے ایک بار ہنسنے کی آس میں جانے کب دیوار سے ٹیک لگائے سو گیا۔ مجھ جیسوں کے لیے یہ نیند اور خواب کتنی بڑی نعمت ہیں۔ بیداری میں کچھ نہ پانے والے اکثر اپنے خوابوں میں مرادیں پالیتے ہیں۔ میری منت بھی خواب میں پوری ہو گئی۔ میں اس کی آرٹ گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ حسب معمول اپنے کو مل ہاتھوں کی جادو گری سے میرے مجسمے میں جان ڈال رہی تھی۔ مجھے تو وہ خود ہمیشہ کی طرح ایک مجسمہ لگ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے، دنیا کی کسی زبان یا ڈکشنری کا کوئی لفظ بھی تو ایسا نہیں تھا، جو ہم دونوں کے دل کی باتوں کو کسی بولی میں ڈھال کر منتقل کر سکتا ہو۔ ایسی صورت میں صرف نظری نظر کے لیے زبان کا کام دیتی ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر اُس کے ساتھ نظر کی یہ بولی بولتا رہا اور پھر کسی نے مجھے زور سے آواز دے کر اٹھا دیا۔ ”چل بھی ملنگ بادشاہ.....“ تھانے دار صاب تجھے بلا رہے ہیں“ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، صبح ہو چکی تھی۔ مجھے ہتھکڑیوں سمیت تھانے دار کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں پہلے سے چند دیگر پولیس افسر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ تھانے دار خود ایک جانب مؤدب سا کھڑا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ بیٹھے ہوئے افسر خصوصی طور پر کہیں اور سے یہاں آئے تھے۔ سب نے مجھے غور سے دیکھا۔ میرے چند خاکے بنائے گئے اور پہلے سے لائے گئے چند خاکوں اور تصویروں سے میرا حلیہ جوڑا گیا، پھر ایک افسر نے جو عہدے میں ایس پی تھا، مجھ سے پہلی بار براہ راست بات کی۔ ”ریاست پور سے صرف اتنا پتا چلا کہ تم نے کچھ مہینے وہاں بستی سے باہر درخت تلے گزارے تھے۔ اس سے پہلے تم کہاں تھے؟“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”فقیر کا کوئی ایک ٹھکانہ کب ہوتا ہے صاب۔ اس سے پہلے شکر گڑھ کے ریلوے پلیٹ فارم پر ڈیرہ تھا اور اس سے پہلے کہیں اور ویرانہ ٹھکانہ تھا..... اب آپ کی یہ حوالات ہے۔“ ایس پی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”مگر تمہارا یہ لب و لہجہ، یہ اعتماد، تمہارے حلیے کو غلط ثابت کرتا ہے۔ ہمیں الجھا رہا ہے تمہارا یہ اعتماد، میں جانتا ہوں، جن جگہوں کا تم نے ابھی نام لیا، تم نے ضرور وہاں وقت گزارا ہو گا، مگر آخر تم ہو کون؟ تمہارا شناختی کارڈ بھی تو نہیں ہے، جس سے تمہاری پیدائش وغیرہ کا ریکارڈ دیکھا جاسکے۔“ میں نے کمرے میں بیٹھے باقی سب لوگوں پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ”حیرت کی بات ہے، کوئی اگر آپ جیسی کو توالی کے سامنے بات کرتے ہوئے لڑکھڑا جائے، اس کی آواز کانپے، تب بھی آپ لوگ اس پر جھوٹا ہونے کی تہمت لگا دیتے ہیں، اور اگر کوئی ہٹا گھبرائے اپنا مدعا بیان کر دے، تب بھی آپ لوگوں کو اس کا یہ اعتماد مشکوک لگتا ہے۔ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اپنی تفتیش پوری کریں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ میرے لیے اب سلاخوں کے پیچھے یا اس زندان سے باہر ہونا ایک جیسا ہے۔ میں دونوں طرف ہی قید رہتا ہوں۔ آپ اطمینان سے اپنی تسلی کریں.....“ میں خاموش ہوا تو ان سب کے منہ ہوتے ہوئے چہروں پر مزید کئی شکلیں پڑ چکی تھیں۔ ایس پی نے میرے سامنے ایک تصویر رکھی، جو میرے موجودہ حلیے سے کافی حد تک مشابہہ تھی۔ ”ہمیں اس شخص کی تلاش ہے۔ یہ دشمن ملک کا جاسوس ہے۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی کے بہت سے منصوبوں پر عمل کر چکا ہے اور ابھی تک معصوم لوگوں کی جان کے درپے ہے۔ تمہارا حلیہ اور تمہاری ادھوری کہانی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم ہی دہشت گرد ہو۔ جس کے نہ جانے کتنے نام اور بہروپ ہیں۔ یہ بھی تمہاری طرح بہت سے علاقوں میں جو گی، فقیر یا ملنگ کے حلیے میں گھومتا رہتا ہے اور موقع پاتے ہی اپنا کام کر جاتا ہے۔ سیکڑوں معصوموں کو دھماکوں میں موت کے گھاٹ اتار چکا ہے یہ اب تک..... لہذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی پوری شناخت واضح کر دو، ورنہ ساری غرائبی سلاخوں کے پیچھے پڑے سڑتے رہو گے۔“ اس کا لہجہ اور ان سب کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی حال میں میری شناخت جانے بنا وہاں سے مجھے جانے نہیں دیں گے، مگر میں انہیں کیا بتاتا۔ میں جس شناخت سے ساری غم بھرا گتار تھا، وہ ایک بار پھر میرا مذاق اڑانے کے لیے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے پولیس والوں کو پھر وہی جواب دیا کہ میری شناخت ایک بھکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں، مگر وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا اور اگلے روز مجھے ضلع کی بڑی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ میری تصویریں کھینچ کر اخبار اور اشتہار کے ذریعے علاقے میں منادی کروادی گئی کہ علاقہ پولیس نے ایک مشکوک کو دہشت گردی کے شے میں پکڑا ہے۔ کسی کو اس کے بارے میں اطلاع ہو تو آ کر پولیس سے ملے۔

اگلی صبح سب سے پہلے مجھے شکورے اور مہر دین کی آوازیں سنائی دیں۔ پولیس والے انہیں دو جاہل بوڑھے دیہاتی سمجھ کر دھنکار رہے تھے، جب کہ وہ دہائیاں دے رہے تھے کہ پکڑا جانے والا کوئی دہشت گرد نہیں، ان کا جو گی سائیں ہے، مگر وہاں کوئی ان کی سننے والا نہیں تھا۔ پولیس والوں نے صبح ہی میری انگلیوں کے نشانات لے کر جانچ کے لیے بڑے شہر بھجوا دیئے تھے۔ شکورے اور مہر دین کو تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ملاقات کی اجازت ملی تو وہ دونوں رو پڑے۔ ”سائیں جی! تم ان کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم وہ نہیں ہو، جو یہ سمجھ رہے ہیں۔“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”شاید میں وہ نہیں ہوں، جو تم دونوں مجھے سمجھ رہے ہو اور پھر تم دونوں نے ہی تو کہا تھا کہ سکینہ کا دیکھا ہوا ہر خواب سچ ہوتا ہے، تو شاید اس کے خواب کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔“ وہ دونوں میرے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھ پکڑ کر روتے رہے اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شکورے نے جاتے جاتے مجھے بتایا کہ جس دن سے سکینہ نے وہ خواب دیکھا ہے، تب ہی سے وہ دعا کے لیے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہے اور اپنے رب سے ہر گھڑی رورو کر صرف یہی دعا مانگ رہی ہے کہ سائیں کو کچھ نہ ہو، سائیں جی کو ان سب کی غم لگ جائے، مگر سائیں کی آنے والی فائصل جائے..... اور پھر اگلی صبح چائے پہنچانے والے سنتری نے آ کر زوردار انداز میں سلاخیں کھڑ کائیں۔ ”اٹھ جاؤ ملنگ بادشاہ..... تمہاری رہائی کا پروانہ آ گیا ہے۔“ میں حیران سا حوالات سے باہر نکلا تو تھانے دار نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا۔ اس بار اس کا لہجہ بہت نرم اور معذرت خواہانہ تھا۔ ”معاف کرنا فقیر..... ہم بھی انسان ہیں، ڈیوٹی کرتے وقت اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ شک کے اوپر ہمارے یقین کا قلعہ کھڑا رہتا ہے۔ اس کے بغیر ہمارا کام ہی نہیں چلتا۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ اتنی وضاحت کیوں پیش کر رہے ہیں۔ میں نے تو ہلکی سی شکایت بھی نہیں کی۔“ تھانے دار نے چائے والے لڑکے کو چائے، ناشامیز پر سجانے کا اشارہ کیا۔ ”تم نے کوئی شکایت یا گلہ نہیں کیا۔ اس بات نے مجھے مزید شرمندہ کر رکھا ہے۔ ہم جس دہشت گرد کی تلاش میں تھے، اُسے کل رات سرحد کے قریب سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تمہارے فتنہ پر منس کی رپورٹ بھی کلیئر آئی ہے۔ اب تم آزاد ہو۔ جہاں جانا چاہو، جاسکتے ہو۔ مگر پہلے ناشتا کر لو۔“ میرا دل اس وقت کچھ بھی کھانے پینے کا نہیں تھا، مگر

تھانے دار کا دل رکھنے کے لیے میں نے چائے کے چند گھونٹ حلق سے اتارے اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ تھانے دار میرے ساتھ برآمدے تک آیا۔ ”کہاں جاؤ گے؟“ ”کوئی منزل نہیں ہے میری، جہاں قدم اٹھیں گے، اُسی طرف نکل جاؤں گا۔ آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ۔“ تھانے دار مجھ سے مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا، مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ ”شاید تمہیں اپنے متعلق بات کرنا کچھ زیادہ پسند نہیں، چلو جیسے تمہاری مرضی، اکرم خان نام ہے میرا۔ کبھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو یاد رکھنا۔ اور ہاں، کل جو دیہاتی تمہارے حق میں گواہی دینے کے لیے آئے تھے، اگر وہ دوبارہ آئیں تو انہیں کیا بتاؤں؟“ میں نے پلٹ کر تھانے دار کی طرف دیکھا۔ ”اُن سے کیسے گاہیاں فنا ہونا، میرے نصیب میں نہیں تھا، جہاں لکھی ہو گی، وہاں خود پہنچ جاؤں گا۔ میری تلاش میں بھٹکنے کی کوشش نہ کریں۔“

میں اکرم خان کو وہیں ہٹا بٹکا چھوڑ کر تھانے کی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ پھر وہی ٹیل اور وہی دیوار۔ میں قصبے کی طرف جاتی پگڈنڈی کی مخالف سمت میں چل پڑا۔ راستے میں بادلوں نے مجھے تنہا چلتے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کیں اور پھر سارے بادل زور سے گڑگڑا کر ہنس پڑے۔ شریر بوندیں ایک بے گھر بنگارے کے ساتھ آنکھ پھولی کا کھیل کھیلنے، بادلوں کی گود سے ایک ایک کر کے زمین کی طرف لپکنے لگیں۔ بادلوں نے بنگارے کو بھیگتے دیکھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی جھولی میں بند ساری شرارتی بوندیں اس پر برسا دیں، اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ویرانے میں برستی بارش کی بوندوں کی بولی کوئی سُنے تو اسے بارش کی تنہائی پر بھی پیار آ جائے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ مجھ سے انکھیلیاں اور ضد کر رہی تھیں کہ میں بھی دوسروں کی طرح ان کے شور سے گھبرا کر کسی درخت یا اوٹ کی پناہ تلاش لوں، مگر میں نہیں رُکا۔ بھیگتا رہا، اور بہت دُور تک پونہی چلتا رہا، وہ بہت دیر تک مجھے یاد آتی رہی اور اس اجنبی ویرانے کے اجنبی رستے میری تنہائی پر مُسکراتے رہے۔ یہ شاعر بھی کیسے کیسے خیال جوڑ لاتے ہیں اپنی تخیل کی کرسٹاتی دنیا سے، زندگی کے ہر قدم پر ہمیں ان کے بول کسی نہ کسی طور اپنے حال سے بڑے محسوس ہوتے ہیں۔ گھنٹہ بھر بھیگنے کے بعد مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ مگر نہ جانے میں کہاں تھا۔ یہ کون سی جگہ تھی۔ شام ڈھلنے والی تھی، کچھ دیر بعد کسی تیل گاڑی والے نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے آواز لگائی۔ ”کہاں جا رہے ہو صوفیو! میں پہنچا دوں؟“ میں نے اس دیاوان سے پوچھا۔ ”یہ رستہ کہاں جاتا ہے؟“ وہ کوئی پرانا لطیفہ یاد کر کے زور سے ہنسا۔ ”راستہ تو کہیں نہیں جاتا..... یہیں پڑا رہتا ہے دن بھر فقیر..... بس میں ہی آتا جاتا رہتا ہوں۔“ مجھے اس کی زندہ دلی اچھی لگی۔ اس دور میں بھی اگر کوئی اپنے مَن کی الجھنیں بھلا کر لبوں پر ایک ہلکی سی مسکان برقرار رکھ سکتا ہے، تو یقیناً وہ ”دل والا“ ہے۔ تیل گاڑی نے مجھے کچی سڑک تک پہنچا دیا، جہاں سے اگاڈ کا سوار یاں گزر رہی تھیں، مگر میری حالت سردی لگنے کی وجہ سے گزرتی جا رہی تھی، رات ڈھلنے سے پہلے مجھے بخار ہو چکا تھا۔ کسی بس والے نے ترس کھا کر مجھے بٹھالیا اور ہٹا پوچھے ہی ایک ویران سے ریلوے اسٹیشن پر اتار دیا۔ شاید وہی بس کا آخری اسٹاپ تھا۔ ساتھ ہی اس نے اسٹیشن کے ایک چڑاسی کو میرا خیال رکھنے کا بھی کہہ دیا۔ بخار نے میرے حواس اس بُری طرح متاثر کیے تھے کہ میں خود کوئی فیصلہ لینے کے قابل ہی نہیں رہا تھا، ریلوے اہل کار نے میری حالت دیکھی، تو مجھے کسی بڑے شہر جانے والی ریل گاڑی پر سوار کروا دیا اور ٹی ٹی سے درخواست کی کہ مجھے شہر پہنچتے ہی کسی قلمی یا مزدور سے کھلوا کر شہر کے بڑے اسپتال پہنچا دے۔ دو دن کا طویل سفر میرے ہوش اور بے ہوشی کے وقفوں میں یوں گزرا کہ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ گاڑی رُکی تو میں بھی ٹی ٹی کو ہٹا بتائے لڑکھڑاتا ہوا پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ میں مزید ان لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ تھکن کے مارے میرا بُرا حال تھا اور غنودگی کے غلبے نے مجھے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ جب آنے اور جانے والے مسافروں کی بھیڑ مٹھی تو میری نظر پلیٹ فارم کے گھڑیال کے ساتھ لگے جلتے بجتے برقی بورڈ پر پڑی، جس کے اوپر شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ میرے اندر ایک دم شدید اور کان پھاڑ دینے والا شور سا اُٹھا، جیسے میری روح کے سارے تار ایک ہی جھٹکے میں کسی نے جھنجھنا کر رکھ دیئے ہوں۔ یہ تو میرا اپنا شہر تھا۔ ہاں، وہی شہر، جہاں میں پیدا ہوا تھا، وہی شہر جہاں وہ کوچہ جاناں تھا، جہاں وہ رہتی تھی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنے اور پلیٹ فارم سے نکلتی ایک گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کی، مگر لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ کسی قلمی نے آخری وقت پر مجھے سنبھال لیا، ورنہ شاید میں ٹرین کے نیچے آ کر کٹ جاتا۔ میرے ارد گرد لوگوں کا جھوم اکٹھا ہونے لگا۔ تماشا کہیں بھی ہو، تماشا بین مل ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں تماشا دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ وہ سب مجھے بُری طرح جھاڑ پلا رہے تھے اور اس حماقت پر ڈانٹ رہے تھے، کچھ نے مجھے خود کشی کے ارادے کے جُرم میں پولیس کے حوالے کر دینے کا مشورہ بھی دیا۔ خود کشی بھی کتنا عجیب جُرم ہے، جُرم کا ارادہ ہو یا اگر جُرم نامکمل رہ جائے تو اس کے لیے کڑی سزا ہے، مگر یہی جُرم اگر مکمل ہو جائے تو دنیا کا ہر قانون اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے، اتنے میں کسی شناسا کی آواز جھوم میں ابھری۔ ”ہو دو رہیہاں سے، جاؤ اپنا کام کرو تم سب لوگ.....“ میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ آخر وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان سسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن“ دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رفقوں، بدینت آنیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہوا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں کس قدر غفلت سے کام لیتے ہیں، ہماری سوچ کی پرواز سے بھی تیز، جلد باز اندیشے، مجھے یہی خدشہ تھا کہ یہاں مجھے اپنا کوئی پُرانا جاننے والا نہ مل جائے، اور ٹھیک اسی وقت بھیڑ کودھکیل کر اندر آنے والے نے میرا اندیشہ بچ کر دکھایا۔ آنے والا خانو تھا، کچھ دیر کے لیے تو وہ مجھے دیکھ کر گرم صم ہی رہ گیا۔ خود میں بھی اسے یہاں اپنے شہر کے پلیٹ فارم پر دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ خانو دوڑ کر مجھ سے پلٹ گیا اور رونے لگا ”کیوں ظلم کرتے ہو ہم غریبوں پر سائیں، کیوں بار بار مجھے اکیلا چھوڑ جاتے ہو؟“ میں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے علیحدہ کیا۔ ”مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو.....؟“ آس پاس کھڑے لوگ حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ خانو نے حسب عادت کسی حوالہ دہ کی طرح سب کو ڈانٹا ”جاؤ یہاں سے بابا..... کیا مصطفیٰ قریشی کی کوئی فلم چل رہی ہے، جو تم سارے یوں منہ کھول کر کھڑے دیکھ رہے ہو۔ جاؤ، کام کرو اپنا، شکر کرو سائیں جی! دھر آ گیا ہے، اب دیکھنا کیسے تم سب کی قسمت بدلتی ہے۔ چلو، اب بھاگو سارے یہاں سے۔“ دھیرے دھیرے بھیڑ ٹھنسنے لگی۔ خانو نے مجھے بتایا کہ اس کے حالات ذرا بہتر ہوئے تو بیوی نے ضد کی کہ اب انہیں بچوں کی تعلیم کے لیے یہ چھوٹا قصبہ چھوڑ کر کسی بڑے شہر منتقل ہو جانا چاہیے، لہذا خانو نے کچھ عرصہ قبل کسی سے سفارش کروا کر یہاں کے ریلوے اسٹیشن پر اپنا چھوٹا سا کیمپ بنالیا اور اب وہ اپنی بیوی بچوں سمیت اسی شہر میں منتقل ہو چکا تھا۔ جانے میری قسمت کے خالی کھنکول میں مقدر بار بار وہی پرانے سنے کیوں ڈال دیتا تھا۔ مجھے خانو کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ سیدھا سادہ بے لوث انسان میرے لیے اپنی جان سے بھی گزر سکتا تھا، مگر..... وہ میرا نادان دوست تھا۔ اور مجھے شاید کسی نادان دشمن کی تلاش تھی۔ خانو کا کھوکھو کھایاں بھی خوب چلتا تھا اور اس نے اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی سب پر اپنا خواہ مخواہ کا رعب جما رکھا تھا۔ خانو نے تھوڑی دیر ہی میں پلیٹ فارم کے ٹیڈ سے پرے کھلے آسمان تلے ایک بوڑھے ہر گد کے درخت کے نیچے میرا بستر بٹا دیا۔ فقیر کا ٹھکانہ بھی بھلا کیا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ ایک پھنپھناتا چھپر، جو نہ دھوپ روک سکتا ہے نہ بارش۔ درخت کے نیچے یہاں بھی کچی اینٹ اونٹ سیٹ سے بنے ایک گول چبوترے نے ہر گد کی جڑوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، بالکل میرے غموں کی طرح، جو ہر لمحہ میرے گرد اپنا گھبراڈالے رکھتے تھے۔ رات کو گھر جانے سے پہلے خانو کچھ دیر میرے پاس رُکا اور میری خستہ حالی دیکھ کر گھبرا گیا ”تمہیں تو شاید شدید بخار لگتا ہے جو گی سائیں۔“ ”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس ٹھکن ہے بہت لمبے سفر کی، تم جاؤ بیوی بچے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے، مجھے ابھی جاگنا ہے، اس شہر کا آسمان اور یہ تارے میرے پرانے دوست ہیں۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں، ان سے مجھے آج رات.....“ نہ چاہتے ہوئے بھی خانو مجبور اُوہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ مگر اس کے جاتے ہی جانے کیوں مجھے یہ احساس ستانے لگا کہ میں اسے کچھ دیر مزید روک لیتا تو اچھا تھا۔ میرے لیے یہ احساس ہی بڑا جان لیوا تھا کہ میں اپنے ہی شہر میں تنہا ہوں۔ ریت، اینٹوں اور سیمنٹ کی بنی چند عمارتوں اور سڑکوں سے پرے شاید وہ بھی اسی تاروں بھرے آسمان تلے جاگ رہی ہو گی، شاید اپنی آرٹ گیلری میں کوئی مجسمہ تراش رہی ہو گی یا پھر شاید اپنی چھت پر اپنی پسندیدہ زرد پھولوں والی نیوی بلیو شال پہنے ہاتھ میں کافی کا گگ تھا میری طرح ستاروں سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ آسمان بھی تو اس کی شال کی طرح تھا۔ میری آنکھیں بھیگنے لگیں، تو مجھے اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوا، کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں، جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی کتراتے ہیں۔ میں بھی ساری رات خود سے بھاگتا رہا۔

صبح تک میں مزید نہ حال ہو چکا تھا اور جب دن کی روایتی بھیڑ اور چہل پہل کا دور شروع ہوا، تو حسب معمول سب سے پہلے ضعیف العقیدہ لوگ ہی میرے آس پاس جمع ہونے لگے۔ شاید اس میں میری پرانی شہرت کا بھی ضرور کچھ حصہ رہا ہو گا، کیوں کہ ریلوے کے جن اہل کاروں کی ٹرین ڈیوٹی کا رُوت شکر گڑھ رہا تھا، وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے اور انہوں نے میری نام نہاد ”کرامات“ کے بہت قصے سُن رکھے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے آتے جاتے لوگوں کو یوں ٹھٹھک کر درخت کے قریب جمع ہوتے دیکھا۔ تو وہ بھی اپنے دفتر سے باہر نکل آیا اور جھڑک کر پوچھنے لگا ”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے، کون ہے یہ مجذوب؟“ اسٹیشن ماسٹر کی آواز سن کر ریلوے کے چھوٹے موٹے اہل کار ادھر ادھر بدک گئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے مجھے غور سے دیکھا ”کون ہو تم..... اور کیا تم جانتے نہیں کہ ریلوے کی سرکاری زمین پر کوئی بھی مستقل یا عارضی بستر اڈالنا ممنوع ہے۔“ میں بہ مشکل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا ”بسترے بھی بھلا کبھی ممنوع اور غیر ممنوع ہوتے ہیں جناب؟ شاید کمین ممنوع یا غیر ممنوع ہوتے ہیں۔“ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے، مگر بخار کی ٹھکن اور فہمت کی وجہ سے ایک زوردار پکڑ آیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے تھامنے کی کوشش کی ”ارے ارے..... سنجنیل کے بھی، تمہاری طبیعت تو بہت ناساز لگتی ہے۔“ اسٹیشن ماسٹر کی آواز پر قلعی دوڑے چلے آئے اور انہوں نے بھی مجھے سہارا دے کر دوبارہ میرے مسکن پر بٹھادیا، میں نے اسٹیشن ماسٹر کو تسلی دی ”نہیں، میں ٹھیک ہوں، میں خود بھی یہاں سے جانا چاہ رہا تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ زیادہ دیر نہیں کھوں گا یہاں پر۔“ اسٹیشن ماسٹر کے چہرے پر ندامت کے آثار تھے۔ ”نہیں نہیں، ایسی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم تو جانتے ہو، کچھ لوگ اسی طرح چپتر ڈالتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے سرکاری زمین پر پہلے پکا جھوپڑا اور پھر چار دیواری کھڑی کر کے قبضہ کر لیتے ہیں۔ بطور اسٹیشن ماسٹر میرا فرض ہے کہ میں پلیٹ فارم اور اسٹیشن کی حدود میں کسی بھی ناجائز تجاوز کو روکوں، مگر تم اس وقت اس قابل نہیں ہو کہ اپنے بل بوتے پر ایک قدم بھی چل سکو۔ کچھ دن آرام کرو، طبیعت سنجنیل جائے تو چلے جانا۔“ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ ”آپ کی مہربانی کا بہت شکریہ۔ مگر یہ شہر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ آپ ایک احسان اور کردیں مجھ پر، یہاں سے کہیں بہت دور دراز جانے والی کسی گاڑی پر سوار کروادیں مجھے.....“ اتنے میں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کا ایک ماتحت وہاں آ پہنچا۔ سپرنٹنڈنٹ آفس سے فون ہے آپ کا صاحب۔“ اسٹیشن ماسٹر نے سر ہلایا اور جانے سے پہلے ایک لمحے کے لیے میرے پاس رُکا ”اعجاز نام ہے میرا، فی الحال تم آرام کرو۔ میں ذرا دفتر کے معاملات نمٹاؤں، تمہارے جانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ ذرا صبر سے کام لو۔“ اسٹیشن ماسٹر پلٹ گیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے زندگی میں کڑواہٹ کی اس قدر عادت ہو چکی ہے کہ اب بیٹھے کی عادت ہی نہیں رہی، پھر چاہے وہ صبر کا پھل ہی کیوں نہ ہو۔

کچھ دیر بعد ایک ریلوے اہل کار بخار کے شربت کی بوتل اور چند گولیاں مجھے تھما گیا۔ ”یہ دوایاں اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بھیجی ہیں۔ جلدی سے یہ گولیاں اور شربت ٹنک جاؤ۔ ہمارے اعجاز صاحب نے ڈسپنسر کورس بھی کر رکھا ہے۔ یہاں سب کی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج وہ خود ہی کرتے ہیں۔ شام کو ان کی جیشک میں خوب جھوم رہتا ہے۔“ وہ باتونی نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور تب تک وہاں سے نہیں ہلا، جب تک میں نے دوا کی خوراک لے نہیں لی، کچھ لوگ اپنے لفظ اتنے بے دریغ کیوں لاتے رہتے ہیں۔ جانے مجھے ہمیشہ سے ایسا کیوں لگتا تھا کہ لفظ ادا ہونے کے بعد ہمیں خالی کر جاتے ہیں۔ کچھ دیر میں خانو آ گیا اور اپنا کیمپ کھولنے کے بجائے سیدھا میری طرف چلا آیا۔ ”سائیں جی، وہ کالو ٹھیلے والا بتا رہا تھا کہ اپنے اسٹیشن ماسٹر صاحب آئے تھے تمہاری طرف، سب خیر تو ہے نا!!“ ”ہاں، سب خیر ہے، وہ اپنا فرض پورا کرنے آئے تھے۔ اچھے انسان ہیں۔“ خانو کے چہرے پر چھائی فکر مندی کی لکیریں چھٹ گئیں۔ اور وہ وہیں کھڑے کھڑے اعجاز صاحب کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا کہ دیکھنے میں تو اسٹیشن ماسٹر صاحب بہت سخت نظر آتے ہیں، مگر دل کے بہت اچھے ہیں، سب ملازمین کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ، جانے یہ اوپر سے سخت نظر آنے والے اکثر اندر سے اتنے نرم اور نیک دل کیوں ہوتے ہیں۔ شاید یہ ساری دنیا ہی ایسے تضادات کا مجموعہ ہے۔ میں دن بھر وہیں منہ ڈھانپے پڑا رہا۔ فقاہت اور بیماری بھی کتنی بڑی معذوری ہوتی ہے۔ یا تو ہمارے دل اور دماغ کو اتنی قوت پرواز نہیں دی گئی ہوتی یا پھر ہمیں اس کم زور جسم اور قوت ارادی کے تابع نہ کیا گیا ہوتا کہ ہم اپنے ارادوں کی تکمیل کی خواہش میں بس پھڑک کر ہی رہ جائیں۔ میں بھی سارا دن اسٹیشن چھوڑ کر کہیں دور نکل جانے کے اپنے کم زور ارادے سے لڑتا رہا، مگر میرے لاغر جسم نے میرا ساتھ نہ دیا۔

شام کو اعجاز صاحب نے بھی دوسرا پھیر اڈالا اور حال چال پوچھ کر جاتے جاتے جانے کیا سوچ کر دوبارہ میری طرف پلٹ آئے۔ ”بات چیت سے تو تم کافی پڑھے لکھے لگتے ہو، پھر یہ جو گ کیوں لے رکھا ہے۔ مجھی معاف کرنا میں اس جہری فقری پر اعتبار نہیں کرتا۔ آج کل کے اس منافق دور میں اصل پیر فقیر بھلا کہاں پائے جاتے ہیں؟“ اعجاز صاحب کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ میں نے تائید کی۔ ”ٹھیک کہتے ہیں آپ، کاش! یہ چھوٹی سی بات اس ظاہر پرست دنیا کو بھی سمجھ آ جائے کہ صرف حلیہ، درویشی کی ضمانت نہیں ہوتا۔ دیوانے اور مجذوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ اعجاز صاحب نے چو تک کر میری طرف دیکھا۔ ”آدمی دل چسپ لگتے ہو۔ موقع ملا تو کبھی تفصیلاً بات ہو گی۔ تم آرام کر لو۔“ اسٹیشن ماسٹر کے جاتے ہی دور اپنے ٹھیلے پر بے چین کھڑا خانو لپک کر میرے قریب آ گیا، ”کیا کہہ رہے تھے، اسٹیشن ماسٹر صاب! میرے متعلق تو کچھ نہیں کہا۔“ ”ہاں کہہ رہے تھے کہ یہ خانو سارا دن ادھر کی ادھر لگا رہتا ہے، دل لگا کر کام نہیں کرتا، وقت ضائع کرتا ہے۔ سوچ رہے ہیں کہ تمہارے ٹھیکے کا لائسنس منسوخ کر دیں۔“ میری بات سن کر خانو کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ”کیا بول رہے ہو جو گی سائیں، میں تو سارا دن محنت کرتا ہوں۔“ ”تم محنت کم، باتیں زیادہ کرتے ہو۔ آج سے کوشش کرو کہ انہیں دوبارہ تم سے شکایت نہ ہو۔“ خانو نے جلدی سے سر ہلایا اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جلدی سے اپنے ٹھیلے کی جانب بڑھ گیا اور میں نے سکون سے سر نکالیا۔ میں جانتا تھا کہ اب رات گئے تک کام میں بھار ہے گا، میرا وہ نادان دوست۔

شام ڈھل چکی تو میرے دل کے اندھیرے بڑھ گئے اور اسٹیشن روشنیوں سے جگمگانے لگا، مگر جو میرے تاریک دل کو اُجالا سکتا، وہ اُجالا کہاں تھا میری قسمت میں۔ خانو بے چارہ دن بھر کام میں بٹھا رہا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے اسے بتا کر جاؤں گا کہ میں نے اس کی ناز برداری اور خدمت گزاری سے بچنے کے لیے یہ جھوٹ بولا تھا۔ میں وہ پتھر تھا، جس سے ٹکرانے والا پجاری بدلے میں صرف زخم ہی پاسکتا تھا۔ رات ہوئی تو

اسٹیشن ماسٹر صاحب معمول اسٹیشن کا ایک آخری جائزہ لینے کے لیے پلیٹ فارم پر سارے موجود اہل کاروں کو ہدایت دیتے نظر آئے، مگر جانے کیوں اس رات مجھے اعجاز صاحب کی چال اور آواز میں وہ بالکلین اور کڑک مفقود محسوس ہوئی، جوان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ رک گئے ”تم سوتے نہیں ہو کیا، طبیعت اب کیسی ہے تمہاری؟“ ”ٹھیک ہوں، بس نیند آتے آتے آتی ہے۔“ وہ جھٹکے ہوئے انداز میں وہیں چبوترے پر میرے قریب بیٹھ گئے ”ہاں ٹھیک کہا تم نے، کبھی کبھی تو نیند بھی غریبی شہزادی بن جاتی ہے۔“ ”آپ آج کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ سب ٹھیک ہے؟“ انہوں نے ایک گہری سانس لی ”ہاں، اب تو ٹھیک ہی سمجھو، وہ کہتے ہیں ناں، درد کا حد سے گزر جانا ہی دوا ہوتا ہے۔ تم یہاں نہ ہو، اس لیے تمہیں نہیں پتا کہ آج کا دن بڑا بھاری گزرتا ہے مجھ پر۔ پرانے ملازمین سارے واقف ہیں اس کہانی سے۔“ میں نے غور سے اس ٹوٹے ہوئے انسان کی طرف دیکھا۔ ہمارے آس پاس بکھرے ان ہزاروں لاکھوں انسانوں میں سے ہر ایک اپنے اندر کتنا غم چھپائے، کتنا درد دبائے بیٹھا ہے، مگر ہم خود غرضوں کو اپنے سوا دوسرا کوئی نظری کب آتا ہے بھلا؟ ”اگر مناسب سمجھیں تو مجھے کچھ بتائیں۔“ اعجاز صاحب نے لمبی گہری سانس لی ”بس بیوی کی بیماری نے پریشان کر رکھا ہے۔ اس بد نصیب نے بھی کم دن ہی خوشی دیکھی۔ اب تو سارا وقت بستر پر پڑی رہتی ہے۔ ہماری ایک ہی اکلوتی بیٹی تھی ثریا..... بچپن ہی سے ہم دونوں کی جان..... لاڈ اور نازوں سے پلی۔ اسکول کالج سے لے کر یونیورسٹی تک ہر مضمون، ہر مقابلے میں اول۔ چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ سچ پوچھو، تو اس کی خوب صورتی سے ہم دونوں میاں بیوی کبھی کبھی خوف زدہ ہو جاتے تھے، اس لیے جلدی

اس کے ہاتھ پہلے کر کے رخصت کرنے کے منصوبے بناتے رہتے۔ بہت سے رشتے آئے، مگر مجھے خاص طور پر کسی ایسے رشتے کی تلاش تھی، جہاں ساس نندوں کا جھیلنا بھی کم ہو، اور لڑکا معاشی طور پر بھی کافی مضبوط ہو۔ ہم نے ثریا کو بہت نازوں سے پالا تھا۔ اور ہمیں یہ ڈر تھا کہ وہ روایتی ساس نندوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور سختی برداشت نہیں کر سکے گی۔ آخر کار، رشتہ لانے والی نے ایک ایسے لڑکے کے بارے میں بتایا، جو کچھ عرصہ پہلے ہی بیرون ملک سے کافی کچھ کما کر دوبارہ اپنے ملک منتقل ہوا تھا۔ اکیلا رہتا تھا اور یہاں رشتے کا بھی خواہش مند تھا۔ مجھے لگا، جیسے قدرت نے یہ رشتہ میرے صبر کے بدلے ہی بھیجا ہے۔ ہم نے ہر طرح سے چھان بینک کر لی۔ لڑکا واقعی بہت شریف اور خاندانی تھا۔ اور ثریا کی تصویر دیکھ کر تو اس نے رشتے والی کا در ہی پکڑ لیا تھا کہ اب وہ رشتہ کرے گا تو ہماری ثریا سے، ورنہ

ساری عمر کنوارا ہی رہے گا۔ لڑکے کا نام کلیم تھا، مگر میری بیوی اس رشتے کو قبول کرنے میں ذرا ہچکچا رہی تھی۔ ”میں نے حیرت سے اعجاز صاحب کی طرف دیکھا ”مگر کیوں؟“ اعجاز صاحب نے نظریں جھکالیں ”دراصل لڑکا کچھ کم صورت تھا، ہماری شریا کی دودھ جیسی شفاف رنگت کے سامنے کلیم کا گہرا سانولار رنگ اور نین نقوش بہت پیچ محسوس ہوتے تھے۔“ اعجاز صاحب کی بات سن کر مجھے ایک زور کا جھٹکا لگا ”شریائے کلیم کو دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے اس کا کیا فیصلہ تھا اس بارے میں.....“ ”شریاء کا فیصلہ وہی تھا، جو کسی بھی شریف مشرقی گھرانے کی لڑکی کا ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ حق اپنے والدین کو تفویض کر دیا تھا۔ بالآخر ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد قرعہ کلیم کے نام ہی ٹھلا اور ہماری لاڈلی ہماری دعاؤں اور آنسوؤں کے حصار میں کلیم کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔“ پھر آپ اتنے اُداس کیوں ہیں، انسان کا تو اندر خوب صورت ہونا چاہیے کہ بیرونی بد صورتی کی تو عادت پڑ جاتی ہے۔“ مجھے لگا یہ سوال میں نے اعجاز صاحب سے نہیں، خود اپنے آپ سے کیا ہے۔ اعجاز صاحب نے لمبی گہری آدھ بھری۔ ”ہاں! میری شریا نے پہلے دن ہی سے ہماری خوشی کے لیے کلیم کو پورے دل سے قبول کر لیا تھا۔ کلیم تو پہلے ہی سے شریا کے پیار میں دیوانہ تھا، مگر.....!!“ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”مگر کیا؟“ ”مگر یہ دنیا والے بھلا کب کسی کو پھلتا پھولتا اور خوش دیکھ سکتے

ہیں۔ کلیم اور شریا جس محفل میں بھی جاتے اور جہاں سے بھی گزرتے، ان کی جوڑی کو دیکھ کر لوگ معنی خیز اشارے کرتے، طنزیہ مسکراہٹوں کے تہاڑے ہوتے، پہلوئے حور میں لنگور، جیسے فقرے کے جاتے۔ نگ آکر کلیم نے شریا کو کہیں لے جانا ہی چھوڑ دیا، مگر لوگوں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے۔ کلیم اپنی محرومیوں کا غصہ شریا پر اتارنے لگا۔ اس کے کان میں کسی نے یہ بات ڈال دی تھی کہ ضرور شریا کے کردار میں کوئی کھوٹ یا کمی ہوگی، ورنہ اس جیسی پری چہرہ لڑکی کلیم جیسے کم صورت کو کیوں قبول کرتی؟ کلیم کا جنون بڑھتا ہی گیا اور شریا کی خوب صورتی نے اسے نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا۔ اسے گلی محلے، حتیٰ کہ شہر کا ہر بندہ اپنا مذاق اُڑاتا محسوس ہونے لگا۔ شریا کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ مجھ سے اور شریا کی ماں سے ایک بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ رشتہ ہمیشہ جوڑ والوں میں کرنا چاہیے، پھر چاہے یہ جوڑ معاشی حالات کا ہو یا صورت کا۔ بے جوڑ رشتے کبھی زیادہ دیر چل نہیں پاتے۔ کلیم شریا پر شک کرنے لگا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اسے دُشمن کر رکھ دیتا اور پھر ایک دن شریا اس حالت میں گھر واپس آئی کہ اس کا چہرہ اور بدن نیل نیل تھا۔ اور..... اور پھر.....“ اعجاز صاحب کی قوتِ گویائی جواب دینے لگی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا ”پھر کیا ہوا؟“ ”اور پھر شریا کے آنے کے دو روز بعد کلیم نے اسے طلاق بھجوا دی.....“ میری آواز حلق میں آنک سی گئی ”طلاق.....“ ”ہاں! طلاق۔“ تین سال پہلے ہماری شریا گھر واپس آ گئی تھی۔ بہت صابر شاہر تھی میری بیٹی، کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ اس کی ماں نفسیاتی دباؤ اور شوگر سمیت کئی بیماریوں کا شکار ہوتی گئی، مگر شریا سستی رہی۔ اور پھر ایک دن چپ چاپ آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ گئی۔“ مجھے یوں لگا، جیسے اعجاز صاحب نے کوئی کند چھری ٹھیک میرے قلب میں اتار دی ہو۔ ”کیا..... شریا مر گئی؟“ ”ہاں، آج اس کی تیسری برسی ہے۔“ مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔ اعجاز صاحب اٹھ کر چلے گئے۔

مجھے لگا، وہ میری اپنی کہانی سنا کر پلٹ گئے تھے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ دنیا میں بس ایک میں ہی ان عذابوں کا شکار ہوں، مگر یہاں تو ہر قدم پر ایک ”پری زاد“ کسی نئے روپ اور نئے نام کے ساتھ دھرتی پر بیٹھتا ہے۔ اعجاز صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جوڑے ہمیشہ جوڑ والوں کے بھٹے لگتے ہیں۔ اچھا ہوا، میں معنی کی زندگی سے چپ چاپ نکل آیا۔ ہم دونوں بھی تو اسی ظالم دنیا کے باسی تھے، یعنی مجھے قبول کر بھی لیتی تو یہ جگ والے ہمیں جینے نہ دیتے۔ یہاں روپ کا بدل صرف روپ ہے، ترازو کے ایک پلڑے میں خُسن ہو تو دوسرا بات سبھی اسے متوازن کر سکتا ہے، جب وہ خود بھی حسین ہو۔ ساری رات میرے دل و دماغ میں عجیب سی سنناٹا ہوتی رہی، جیسے قدرت نے میری کہانی کا انجام کسی دوسرے کی زبانی مجھ تک پہنچا دیا ہو۔ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر خانو کی ہلکی ہلکی آوازوں نے مجھے دوبارہ جگا دیا۔ صبح ہو چکی تھی، خانو مجھے بتا رہا تھا کہ ”سامیں یہ بی بی کب سے آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہی ہے۔ کہتی ہے، سامیں کا بڑا نام سنا ہے۔ دعا لینے آئی ہے۔“ میں نے چونک کر سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا اور ایک لمحے میں ہی میرے لیے آسمان، زمین پر ڈھے گیا اور زمین فلک سے جا ملی۔ میرے سامنے معنی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں، میری مجسمہ ساز۔ وہی قراۃ العین..... مگر اس کی آنکھوں پر یہ سیاہ چشمہ کیوں لگا ہوا تھا ابھی تک۔ میں نے خانو کو اشارہ کیا کہ وہ لڑکی سے کہے، چشمہ اتار دے، مگر خانو جاچکا تھا۔ میں نے دھیرے سے ہماری آواز میں کہا۔ ”بی بی! اپنے چہرے سے اندھیرے کا یہ پردہ ہٹا دو تا کہ میں تمہاری آنکھوں میں جھانک کر تمہاری روح کے زخم دیکھ سکوں۔“ مگر وہ رو پڑی۔ ”نہیں سامیں جی! میری آنکھیں بے نور ہیں۔ آپ ان میں جھانک کر بھی صرف اندھیرے ہی دیکھیں گے۔ میں زور سے چلا اٹھا۔ ”کیوں..... تمہاری آنکھیں اب تک بے نور کیوں ہیں.....؟ اگر دعائی کروانی ہے تو اپنی پینائی کی دعا کرواؤ۔“ معنی نظریں پُرا گئی۔ ”نہیں سامیں، جس کو دیکھنے کے لیے مجھے بصارت چاہیے تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب میں پینائی کا کیا کروں گی۔“ میں اس کی بات سن کر سسک اٹھا۔ وہ بھی روتی رہی اور پھر اچانک میرے کانوں میں خانو کی آواز گونجی۔ ”سامیں جی! کیا ہوا، سب خیر تو ہے نا..... تم رو کیوں رہے ہو، کیا کوئی بُرا سہنا دیکھا ہے۔“ میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ خانو مجھ پر ٹھکا ہوا میرے گالوں سے میرے آنسو پونچھ رہا تھا۔ گویا میں واقعی خواب دیکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خانو کو سمجھا بجا کر کام پر بھیجا، مگر خود میرا چین و سکون مزید برباد ہو گیا۔ کچھ خواب ہمیں کس قدر بے سکون کر جاتے ہیں۔ سنے کے پنجرے میں بند یہ دل ایک دم ہی ہر دیوار، ہر رکاوٹ توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گیا۔ مجھے لگا، جیسے وہ خواب اُدھور ارہ گیا ہو۔ شاید معنی کی آنکھیں واپس مل چکی ہوں، مگر میری آواز پہچان کر اور میرے چہرے کو دیکھ کر اس نے مجھے نہ پہچاننے کے لیے یہ ساری کہانی گھڑی ہو۔ مجھے خانو پر شدید غصہ آنے لگا، جس نے درمیان میں میری نیند توڑ کر مجھے خواب کے آخری حصے اور انجام جاننے سے روک دیا۔ سکینہ نے کہا تھا کہ محبت میں ایک وقت ایسا آتا ہے، جب ہمارے خواب سچے ہونے لگتے ہیں۔ قدرت نے ایک ہی رات میں مجھے دو اشارے دیئے تھے۔ پہلا شریا اور کلیم کی کہانی سنا کر اور دوسرا یہ اُدھور خواب دیکھا کہ۔ یقیناً قدرت مجھے یہ جانا چاہ رہی تھی کہ معنی اگر پینائی ملنے کے بعد مجھے دیکھ لیتی، تو وہ ضرور رورو کر خدا سے یہی شکوہ کرتی کہ اس چہرے کو دیکھنے سے تو بہتر تھا کہ اسے دوبارہ بصارت ہی نہ ملتی۔ وہ اندھ ہی رہتی تو اچھا تھا۔ میرے اندر چلتے جھکڑ تیز ہونے لگے۔ جیسے واقعی معنی نے مجھے دیکھ لیا ہو۔

میری حالت شام تک اتنی بگڑ گئی کہ سانس بھی آنک آنک کر آنے لگی۔ خانو نے مجھے یوں تڑپتے دیکھا تو پنا کچھ کہے ایک جانب بھاگ گیا۔ اور گھنٹہ بھر بعد شہر کے ایک مستند ڈاکٹر کی دواؤں کا بسکہ اٹھائے اس کے آگے آگے بھاگتا ہوا نمودار ہوا۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی اور تشویش سے خانو کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے سامیں کی حالت تو بڑی خراب ہے، میں دوا کی تین خوراکیں دیئے تو جا رہا ہوں، مگر ہو سکے تو سامیں کو شہر کے بڑے اسپتال پہنچانے کی کوشش کرو۔“ خانو نے تیزی سے سر ہلایا، مگر وہ اندر سے جانتا تھا کہ میں اب یہاں سے کہیں نہیں ملنے والا۔

اگلے روز بادل پھر ٹوٹ کر برے، میری سانس اکھڑنے لگی تھی، جیسے سینے کی قید سے آزاد ہونے میں اسے بہت سی سلاخوں سے ٹکرا کر باہر نکلنا پڑ رہا ہو۔ میری نظر دھیرے دھیرے پتھر آنے لگی، تو خانو نے روتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلو سامیں، ایک بار میری بات بھی مان لو، چلو کسی بڑے اسپتال چلتے ہیں۔“ میں نے برستی بارش کی بوندوں میں خانو کے آنسو پانی میں مل کر پانی ہوتے دیکھے اور مُسکرا دیا۔ میری آواز رُک رُک کر نکل رہی تھی۔ ”کیوں ڈھونڈی کہیں کے..... ذرا سی بیماری نے ہی تمہارے سامیں کی کرامت پر تمہارا یقین اور اعتماد چٹا دیا؟ ابھی کل تک تو تم سارے علاقے میں سب سے کہتے پھرتے تھے کہ تمہارا جوگی سامیں اپنی دعا سے ہر بیماری اور ہر روگ کا علاج کر سکتا ہے۔ اور آج جب خود تمہارا سامیں بیمار پڑا، تم اسے شہر کے بڑے اور تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضد کر رہے ہو۔ اگر میری دعاؤں میں باقی لوگوں کے لیے اتنا اثر ہوتا تو کیا آج میری اپنی بیماری ایک پھونک ہی میں ہوانہ ہو جاتی؟“ تیز بارش میں بھیگتی ایکسپریس گاڑی پلیٹ فارم پر داخل ہوئی، تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کچھ مسافراترے اور کچھ ٹرین پر سوار ہو گئے۔ میں نے دُور اسٹیشن کے بیرونی گیٹ سے ایک نوجوان جوڑے کو اندر آتے دیکھا۔ مرد تیز بارش سے خود کو بچاتے ہوئے کسی کی تلاش میں برآمدے کی جانب بڑھ گیا۔ میری لمبی جٹا دھاری بالوں کی لٹیں بھیگ کر میرے چہرے کے گرد پھیل چکی تھیں۔ میں سر جھکائے یوں مراقبے میں پڑا ہوا تھا، جیسے اپنی آخری سانس نکلنے کا خود انتظار کر رہا ہوں۔ اچانک میرے قریب ہی سیاہ لباس میں کسی نازک سے سراپے کا ہیولا ابھرا اور وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ خانو نے اسے دبے لفظوں میں میری بیماری اور بگڑتی حالت کے بارے میں بتایا، مگر وہ برستی بارش میں یونہی دھرتی پر بیٹھی رہی۔ خانو کو مجبوراً وہاں سے اٹھ کر جانا پڑا تا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے اپنی منت بیان کر سکے۔ فضا بہت غنودگی سے میری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں، مگر جان یوں اٹکی ہوئی تھی، جیسے ضد پر اڑی ہو۔ اور پھر وہ ہلکا سا کھٹکار کر بولی تو اس کی مترنم آواز نے میرے وجود میں ٹھنڈی سبھی خفیہ گھنٹیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے ارد گرد زلزلہ آ گیا ہو۔ میں اس میٹھی آواز کو کیسے بھول سکتا تھا؟ ہاں..... یہ اُسی کی آواز تھی، جس کی سانسوں کی آہٹ بھی میں سن سکتا تھا۔ میرا خواب سچ ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ ”مجھے پتا ہے کہ آپ اپنے ارد گرد خواہتین کی موجودگی پسند نہیں کرتے، اور نہ ہی کسی عورت سے ہم کلام ہونا آپ کو اچھا لگتا ہے، مگر میں آج بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ کئی سال سے بھبک رہی ہوں در بدر..... میرا کوئی اپنا کھو گیا ہے۔ آپ کی دعا کا بڑا جز چاہتا ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ میرے لیے بھی دعا کریں۔“ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، میری دعا میرے سامنے بیٹھی مجھے دعا کرنے کا کہہ رہی تھی۔ وہ بے چینی اور پریشانی میں اپنی خوب صورت انگلیوں کو حسبِ عادت بار بار آپس میں جوڑ کر کھول رہی تھی۔ یہ وہی ہاتھ تھے، جنہوں نے کبھی میرا چہرہ چھو کر ایک مجسمہ تراشا تھا۔ میری ٹھنکی نظر نے اس کے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی دیکھی۔ میں خاموش رہا۔ وہ مجھے پہچان نہیں پاتی تھی، پہچانتی بھی کیسے۔ اس نے آج تک مجھے دیکھا ہی کب تھا؟ میری سانس اکھڑنے لگی۔ مجھ میں اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ میری رُکتی سانسوں کی آواز سن کر وہ گھبرا کر میرے اور قریب آ گئی ”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ دفعتاً میری نظر اس کی آنکھوں پر لگے کالے چشمے پر پڑی تو میرے اندر بے یک وقت کئی جھکڑ چلنے لگے۔ حسبِ توقع ایک چشمہ اس کی خوب صورت سرمئی آنکھوں کا پہرے دار بنا بیٹھا تھا۔ کہیں خدا خواستہ معنی کی آنکھوں کا آپریشن واقعی ناکام تو نہیں ہو گیا تھا۔ تیز بارش اس کا نازک وجود بھگور رہی تھی، میرا جی چاہا کہ میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے وجود کے لیے چھتری بن جاؤں، مگر میں تو خود کسی کم زور پٹے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی دوزانو بیٹھی بھیگتی رہی اور پھر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا دل کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو جیسے۔ اسے آواز دے کر روک لینے کی خواہش کو میں نے نہ جانے کس طرح روکا۔ بس زبان دانتوں تلے داب لی۔ مڑتے ہوئے اچانک پانی میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ڈھنگائی، میں تڑپ کر اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کے طور پر آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ کسی سہارے کی تلاش میں فضا میں لہرائے اور میرے چہرے کو چھو گئے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا، وہ کچھ لمحوں کے لیے حیرت اور صدمے سے ششدر رہ گئی اور پھر اس نے بے تابی سے دوبارہ میرے چہرے پر اپنی انگلیاں پھیریں اور زور سے چلائی ”پری زاد..... یہ آپ ہی ہیں نا..... آپ چپ کیوں ہیں.....؟ بولتے کیوں نہیں.....؟“ میں اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہاں سے اٹھ کر چند قدم بھاگا، لیکن مجھ میں بھاگنے کی ہمت اور طاقت ہوتی، تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔ میں لڑکھڑا کر یوں گرا، جیسے کوئی کسی کی نظر سے گرتا ہے، مگر مجھے دنیا کی نظر سے گرنے کی پرواہی کب تھی۔ مجھے تو بس اس ایک نگاہ سے بچنا تھا کہ جس میں کبھی میرا ایک مقام تھا۔ مجھے زمانے کی ہر فنا قبول تھی، مگر اس کی نظر میں نفرت یا رحم اور ہمدردی کی جھلک میرے لیے دنیا کی ہر موت سے کہیں بڑھ کر قضا تھی۔ میں نے خود کو پوری طرح سمیٹ کر چھپا لیا۔ اچانک میرے کانوں میں ایک مردانہ آواز گونجی۔ ”کہاں تک بھاگیں گے اور کب تک خود کو چھپائیں گے پری زاد صاحب..... میں آپ کو اتنا کم زور نہیں سمجھتا تھا۔“ ڈاکٹر عدنان میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا، آس پاس چلتے لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ معنی وہیں دُور بیٹھی رورہی تھی۔ میں نے عدنان سے منت کی ”مجھے جانے دو عدنان..... اس کی جس ایک نظر سے بچنے کے لیے میں نے ساری دنیا تیا گ دی۔ وہ نظر میرا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آ پہنچی ہے۔ میں بہت نڈھال اور بڑا گھائل ہوں عدنان۔ مجھے اور زخمی نہ کرو۔ میرا دم میرے اس آخری بھرم

کے ساتھ نکل جانے دو.....“ عدنان کی آواز لرز رہی تھی، اس ایک نظر کا اتنا ہی خوف تھا تو پھر آپ نے عینی سے محبت کیوں کی تھی.....؟“ ”نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ میں نے محبت نہیں کی۔“ عدنان نے میرے لرزتے ہاتھ تھام لیے۔ ”محبت نہیں کی، تو پھر یہ جوگ، تیاگ کیسا؟ اس کا سامنا کرنے کا خوف کیوں۔ کمائی نے امریکا سے واپسی ہی پر ہمیں سب بتا دیا تھا۔ کاش! آپ مجھ سے یہ بات نہ چھپاتے۔ اور پھر ہر گرہ خود کھلتی گئی۔ آپ نے میری محبت کی وجہ سے اپنے آپ کو اس حد تک برباد کر لیا پری زاد، آخر کیوں؟ ایسا کون کرتا ہے، چھین لیتے اُسے مجھ سے۔ اُس پر سب سے زیادہ حق اس ساری دنیا میں صرف آپ کا تھا۔ آپ نے وہ حق بھی مجھے سونپ دیا۔ صرف اس خوف سے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد آپ کو قبول نہیں کرے گی۔ آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ وہ زند گی کے اتنے اہم موڑ پر اپنے فیصلے کیسے کرے گی۔ اس نے آپ کو اپنی زند گی میں سب سے زیادہ مان دیا۔ اس کے کتنے بھرم آپ سے بڑے تھے اور آپ اسی کوچہ منہ دار میں چھوڑ آئے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ آپ کے بغیر کیسے چل پائے گی؟“ میں نے اپنی سانسیں جمع کیں۔ ”میں اس کی نئی رنگوں سے بھری دنیا کو اپنے وجود کی کالک سے سیاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صرف تم ہی اس کے قابل تھے اور میں نے صرف تمہارے بھروسے اُسے چھوڑا تھا، میں جانتا تھا۔ اگر میں اس کا ہاتھ مانگتا، تو وہ مجھے دیکھ کر بھی شاید انکار نہ کرتی۔ کیوں کہ اس کی روح میرے اُن گنت احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی، لیکن مجھے کسی احسان کا بدلہ نہیں چاہیے تھا عدنان..... میری منزل تو بس ایک نظر تھی۔ اس کی پیار بھری ایک نظر۔“ عدنان نے حتیٰ لچھ میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، اگر آپ کو نظر کی پہچان کا اتنا ہی دعویٰ ہے، تو آج یہ بھرم بھی آزما لیتے ہیں۔ وہ آ رہی ہے، دیکھتے ہیں آپ کو دیکھ کر اس کی نظر کیا کہتی ہے۔ آج آپ کے مقدر کی وہ نظر خود فیصلہ کرے گی، جب آپ حسب وعدہ آپریشن سے پہلے نیویارک نہیں پہنچے، تو عینی نے اپنی آنکھوں کے آپریشن سے انکار کر دیا تھا، وہ جان گئی تھی کہ آپ کیوں نہیں آئے۔ میں نے آپ کی قسم دے کر اُس کا آپریشن تو کروادیا، مگر بینائی ملنے کے بعد بھی اس نے اپنی آنکھوں پر آج تک وہ سیاہ چشمہ لگا رکھا ہے۔“ میں چلا اٹھا، ”مگر کیوں، تم نے تو اس کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مجھ سے۔“ تبھی عینی کی آواز میرے قریب سے ابھری۔ ”وعدے تو آپ نے بھی بہت کیے تھے دوستی نبھانے کے پری زاد..... آپ یہ کیسے بھول گئے کہ میرا آپ سے روح کا رشتہ تھا۔ اور جب روح کے رشتے بڑ جائیں تو چہرے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ آپ کو مجھ پر اتنا بھروسا بھی نہیں تھا۔ بس، اتنا ہی جانتے تھے آپ مجھے۔“ خانو نے صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے لوگوں کو پرے دھکیل دیا تھا۔ میں وہیں زمین پر پڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔ عینی نے وہیں زمین پر دو زانو بیٹھ کر میرا سراہنی گود میں رکھ لیا۔ میری جلتی روح کسی ٹھنڈے پانی کی آبشار تلے آ گئی۔ اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا، تو مجھے یوں لگا، جیسے ہر داغ، ہر سیاہی دھلتی چلی گئی ہو۔ میں اس کے ٹھوٹے ہی کتنا خوب صورت ہو گیا تھا۔ ”پری زاد“ بن گیا تھا۔ عینی نے اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمہ اتار لیا، میرے نصیب کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ کسی بھی طنز، حقارت، تمسخر یا نفرت سے مبرا۔ ایک پیار بھری نظر۔ میرے مقدر کی نظر..... ”وہ میرا سرا گود میں لیے بیٹھی روتی رہی۔ اور برستی بارش کی بوندیں، اس کے پاک اور معطر آنسوؤں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے خود ان آنسوؤں میں مل کر پاک ہوتی رہیں۔“ میں بھی کتنی بد نصیب ہوں۔ آپ نے سب سے اچھا کر جس محبت کو اپنے من میں دبا رکھا، اس کی خبر میرے سوا باقی سب کو تھی۔ ایک بار صرف ایک بار مجھ سے کہہ کر تو دیکھتے..... تب میں آپ کو بتاتی کہ آپ میرے لیے کیا ہیں..... اتنا کم زور سمجھ رکھا تھا آپ نے قراۃ العین کو۔“

دُور کھڑے قضا کے فرشتے نے مجھے اشارہ کیا۔ ”انشاء جی اٹھو..... اب کوچ کرو۔“ میں نے چند سانسیں مزید اُدھار مانگیں اور اس مہ و ش کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ ”نہیں عینی..... میں تم پر زند گی کے رنگوں کے دروازے بند نہیں کرنا چاہتا تھا، میرے نہ ہونے سے تمہاری روشن دنیا میں ایسی کون سی کمی ہو جاتی۔ میں تو یوں بھی تمہاری زند گی میں اضافی تھا۔“ اس کے آنسو بارش کی تیز بوندوں کے ساتھ مل کر میرے چہرے کو پاک کرتے رہے۔ ”پہلے میں خود نہیں جانتی تھی پری زاد، مگر آپ سے دُور ہو کر جانا کہ میری ہر کمی آپ ہی سے پوری ہوتی ہے۔ آپ نے خود کبھی کہا نہیں اور مجھے امریکا جا کر پتا چلا کہ آپ اضافی نہیں، لازمی ہیں۔“ میں نے عینی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ہاں..... کبھی نہیں کہہ پایا، مگر آج کہتا ہوں، مجھے تم سے محبت ہے قراۃ العین..... شدید محبت۔“ میری نبض ڈوب رہی تھی، میرے کان میں قضا دھیرے سے گنگنائی۔ ”وحشی کو سکوں سے کیا مطلب..... جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا؟“ آس پاس کا سارا شور مجھے دھیرے دھیرے سر گوشیوں میں ڈھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ جانے لوگ آپس میں کیا سرگوشیاں کر رہے تھے؟ بارش تیز تر ہو کر بھی مجھے بھگو نہیں پار رہی تھی۔ اتنی تیز آمد صبحی کے باوجود، جس سے میرا دم کیوں گھٹ رہا تھا، وہ میرا سرا گود میں لیے زار و قطار رو رہی تھی۔ زند گی سمٹ کر ان چند لمحوں میں سمٹ آتی ہے، جب غم بھر کی ریاضت اور دعائیں رنگ لاتی ہیں۔ آج میری غم بھر کی تپیا بھی پوری ہوئی۔ اب بھلا کس کو جینے یا مرنے سے غرض تھی۔ کتنی صدیاں اس ایک پل میں جی لی تھیں میں نے۔ زند گی نے ہر قرض پکا دیا تھا، میری اضافی اور مانگی ہوئی سانسیں پوری ہونے کو آئیں، تو آس پاس دھیرے دھیرے روشنی کم ہونے لگی، میری آنکھیں پتھر آنے لگیں، کبھی سنا تھا کہ دھڑکن بند ہو بھی جائے تو دماغ کچھ لمحے زیادہ جیتا ہے۔ چاروں طرف ایک عجیب سا شور مچ گیا، جیسے بہت سے لوگ مل کر بین کر رہے ہوں۔ جانے سب رو کیوں رہے تھے، میری پتھرائی آنکھیں تو ابھی تک اُسی نظر پر جمی ہوئی تھیں، جس نے میری تکمیل کر دی تھی۔ خانو دھاڑیں مار مار کر سب سے لپٹ کر میری طرف اشارے کر کے جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ عدنان کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ اس نے عینی کو تھام رکھا تھا۔ ہاں، اب وہی تو اس کا سہارا تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر میرے جسم پر سفید چادر ڈال دی۔ میرا چہرہ واضح رہا۔ مجھے اپنے قدموں کی جانب سے خون کی گردش رُک کر سارے جسم میں جامد ہوتی محسوس ہوئی اور میرے ذہن کے اندھیرے بڑھنے لگے، پھر کسی نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زور سے ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ کہہ کر میرے پونے بند کر دیئے۔ اور میرا دماغ ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں ڈوب گیا۔

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

ضروری بات کہنی ہو، کوئی وعدہ نبھانا ہو

اُسے آواز دینی ہو، اُسے واپس بلانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

مدد کرنی ہو اُس کی، یار کی ڈھارس بندھانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

بدلتے موسموں کی سیر میں، دل کو لگانا ہو

کسی کو یاد رکھنا ہو، کسی کو بھول جانا ہو

کسی کو موت سے پہلے، کسی غم سے بچانا ہو

حقیقت اور تھی کچھ، اُس کو چاکے یہ بتانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

(ختم شد)